مفتاح الحکمت

علامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (قس)

”میزان الحقائق“
دانشوروں کی نظر میں

۱۔ جناب رئیس امروہوی صاحب جو نہ صرف چوٹی کے ایک اہلِ قلم اور ایک برجستہ شاعر و ادیب ہیں، بلکہ نفسیات و علومِ متنوعہ کے سربرآوردہ ماہر بھی ہیں، ”میزان الحقائق“ کے بارے میں اسی طرح رقمطراز ہیں :

ایٹمی انسان : میں اپنے آئندہ مضمون میں روسی سائنس دانوں کی ایک انوکھی دریافت پر روشنی ڈال کر ایٹمی عہد کے انسان یا ایٹمی انسان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ اس موضوع پر اردو میں بھی ایک کتاب ”میزان الحقائق“ لکھی گئی ہے جس کے مصنّف میرے دوست نصیرالدّین نصیؔر ہونزائی ہیں۔ (روزنامہ جنگ ۱۲/ جولائی ۱۹۶۵ء)

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں جناب نصیرالدّین نصیؔر ہونزائی کی کتاب ”میزان الحقائق“ کا تذکرہ کیا تھا، نصیر صاحب ہنزہ (گلگت ایجنسی) کی علاقائی زبان ”بُرُشسکی“ کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور اردو کے ذی علم مصنّف ہیں، میزان الحقائق میں دوسرے بہت سے موضوعات کے علاوہ ایٹمی دَور پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔

نصیؔر صاحب نے اس کتاب میں زندہ ایٹم کا تصوّر پیش کیا ہے۔ لکھا ہے کہ جدید سائنس اب تک ایٹم کے برق پاروں (الیکٹرون، نیوٹرون اور پروٹرون وغیرہ) کے عمل کو دریافت کر سکی ہے، لیکن تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، نصیؔر صاحب کے خیال میں عنقریب وہ وقت آجائے گا، کہ سائنس زندہ ایٹموں یا اُن نوری جانوروں کو بھی دریافت کرلے گی، جو اٹامک انرجی (atomic energy) کو کنٹرول کرتے ہیں اور نوعِ انسانی ایٹمی دَور سے نورانی دَور (یا روحانی دَور) میں داخل ہو جائے گی۔ (روزنامہ جنگ، سنڈے ایڈیشن، ۱۹/ جولائی ۱۹۶۵ء)

میزان الحقائق کے مصنّف جناب نصیرالدّین نصیؔر ہونزائی کا تعارف کرا چکا ہوں یہ ہونزہ اسٹیٹ (گلگت ایجنسی) کی قومی زبان "بُرُشسکی" کے سب سے بڑے اور پہلے شاعر ہیں اردو اور فارسی میں بھی عارفانہ شعر کہتے ہیں، علومِ مخفی (آکلٹ سائنسز) پر نصیر صاحب کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ انھوں نے بار بار، آر۔ این (لاہور) کے تجربے کو "نورانی اجسّام" کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔
(روزنامہ جنگ، سنڈے ایڈیشن، ۲/ اگست ۱۹۶۵ء)

۲۔ جناب مبلّغ عبدالرّؤفؔ صاحب لکھتے ہیں:

مولانا الواعظ نصیرالدّین نصیؔر ہونزائی صاحب کی کتاب "میزان الحقائق" میری نظر سے گذری، اس قحط الرّجال کے زمانے میں، جبکہ انسانیت ختم ہونے کو آئی ہے، ایسی کتابوں کی رہبری سے پھر انسانیت کی معرفت اور خدائی تعلقات کی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں، اس کتاب کا ہر لفظ عالمانہ علمیّت سے معمور ہے، موجودہ سائنسی دَور میں ایسی فلسفیانہ کتابوں کی بہت سخت ضرورت ہے۔ چونکہ مولانا نے اس مادّی دَور کو روحانیّت کی ابتدا ثابت کیا ہے، اِس معاملہ میں وہ

قابلِ مبارک باد ہیں اور ہماری دعائیں ان کے شاملِ حال رہیں گی۔

عبدالرّؤف ؔ مبلّغ اسلام
سیکریٹری دیندار انجمن،
بی ایریا۔ لیاقت آباد، کراچی
۲۵/جولائی ۱۹۶۲ء

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ
خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ

مفتاح الحکمت

از

علاّمہ نصیر الدّین نصیؔر ہونزائی قس

شائع کردہ

المعہد للحکمۃ الرّوحانیۃ والعلم المنیر

www.monoreality.org
www.ismaililiterature.com
www.ismaililiterature.org
global-lectures.com

©2025

اشاعتِ اوّل ۱۹٦۵ء
" دوم ۱۹۹۳ء
" سِوم ۲۰۲۵ء

ISBN 1-917149-01-8

انتساب

حضرت علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی صاحب ق س کی یہ کتاب "مفتاح الحکمت" صوری لحاظ سے مختصر ہونے کے باوجود معنوی لحاظ سے حکمت یا خیرِ کثیر (۲ : ۲۶۹) کا ایک بے پایان خزانہ ہے۔ اس کتاب کا مرکزی مضمون حکمت یا خیرِ کثیر تک رسائی کیلئے وسیلے کی اہمیت و ضرورت ہے، اس لئے کہ یہ حکمت کوئی ظاہری یا جسمانی چیز نہیں کہ جو چاہے اسکو بے روک ٹوک حاصل کر سکے بلکہ یہ ایک باطنی اور روحانی حقیقت ہے جو حدیثِ نبوی کے مطابق ایک خاص الخاص گھر میں رکھی گئی ہے جس کا ایک مضبوط دروازہ ہے اور اس کی چابی خود دروازے کے پاس ہی ہے۔ حکمت یا خیرِ کثیر سے فیضیاب ہونے کیلئے اس بابرکت گھر، دروازہ اور چابی کی شناخت کی ضرورت ہے۔

مصنف موصوف نے اس کتاب میں آیۂ اطاعت جو خدا، رسول اور اولوالامر کی اطاعت پر مشتمل ہے، کی تاویل و تفسیر کرتے ہوئے بڑی وضاحت کے ساتھ انکی شناخت کرائی ہے اور اسکی بھی وضاحت فرمائی ہے کہ حصولِ حکمت یا خیرِ کثیر اولوالامر کی غیر مشروط اطاعت سے مشروط ہے، اسلئے کہ اولوالامر کی اطاعت رسول کی اطاعت اور رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔

جماعت اور دنیائے انسانیت کی روحانی پرورش اور ترقی کے لئے

ایسی روح افزا و عقل پرور کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لئے بہت سی روشن ضمیر و جانثار مومنات و مومنین کی عظیم اور بے لوث خدمات ہیں۔ ان میں سے ایک ظلِّ فاطمہ شازیہ رحیم مومن ہیں۔ آپ خوش خُو و خوش خصال اور دینِ حق کی دل دادہ اور پرستار ہیں۔ آپ کا شوہرِ نامدار ظلِّ قائم رحیم مومن بھی ان ہی خصائل کا حامل ہے۔ آپ کا بیشتر وقت حقائق و معارف پر مشتمل دینی کتابوں کے مطالعے پر صرف ہوتا ہے۔ آپ بسا اوقات دوسری مومنات و مومنین کیلئے بھی دینِ حق کی اہمیت اور اسکے فیوض و برکات کی وضاحت کرتی ہیں۔ آپ کا پورا خاندان علمِ دین کا قدردان ہے۔ آپ کے دو نہایت پیارے لٹل اینجلز سلمان داد مومن اور سکینہ مومن ہیں، یہ نہایت ہی نیک بخت بچے ہیں کہ اس چھوٹی عمر سے احسن طریقے سے ان کو دینی اور دنیوی تعلیم دی جاتی ہے۔ آپ کتنی خوش نصیب ہیں کہ اس مرتبہ بھی "مفتاح الحکمت" جیسی کتاب کی طباعت و اشاعت کے اخراجات برداشت کرتی ہیں۔

ربُّ العزّت آپ کی اس قربانی کو قبول فرمائے اور جماعت اور دنیائے انسانیت اس سے علمی اور عرفانی فوائد حاصل کرتی رہے، اور آپ جملہ افرادِ خاندان کو حضرتِ ربُّ العزّت گوناگون رحمتوں اور برکتوں سے نوازتا رہے!

آمین یا ربَّ العالمین!!

نسرین اکبر
کراچی مرکز
۵/مئی، ۲۰۲۵ء

فہرستِ مضامین

۱۔ سرنامۂ آغاز ۱
۲۔ تقریظ ۴
۳۔ تعارف ۶
۴۔ اظہارِ تشکّر ۸
۵۔ شرح دیباچۂ وجہِ دین ۹
۶۔ تاویلِ اِسترجاع ۱۴
۷۔ آیۂ اطاعت کی تفسیر ۱۶
۸۔ تحقیقاتِ معجزات ۲۶
۹۔ انسانِ کامل کی جسمانی معرفت ۴۶
۱۰۔ جشنِ نوروز ۵۲
۱۱۔ آسمان سے باہر کیا ہے؟ ۵۷
۱۲۔ روحانی مجلس ۵۹
۱۳۔ تاویلِ سُورۂ کوثر ۶۳
۱۴۔ طریقِ استعانت ۶۵
۱۵۔ سیّاروں میں انسان کی سَیاحت ۷۰
۱۶۔ کیا آسمان و زمین سات اور سات چودہ ہیں؟ ۸۲

۱۷۔ فہارس ۹۷

سرنامۂ آغاز

بنام او کہ او نامے نہ دارد

(رئیس امروہوی)

الواعظ نصیرالدّین نصیرؔ ہونزائی ایک شیوا زبان شاعر، حقیقت شناس دانشور اور صاحبِ نظر اہلِ قلم ہیں، مجھے ان کی قربت و ہم نشینی کی سعادت نصیب ہوئی، حال ہی میں موصوف کی عالمانہ اور حکیمانہ تصنیف "میزان الحقائق" کے مطالعے کا موقع ملا۔ میزان الحقائق میں برادرِ موصوف نے ایسی فکر خیز اور بصیرت انگیز حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ "ایٹمی دور روحانی دور کا پیش خیمہ ہے" یہ ایک انقلاب انگیز تصوّر ہے اور الواعظ نصیرؔ ہونزائی نے اس انقلاب انگیز تصوّر کو ایسے دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا ہے کہ دل و دماغ شاداب اور فکر و نظر تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ میزان الحقائق کے مندرجات و حقائق سے مستفید ہونے کے بعد مجھے برادرِ موصوف کی دوسری زیرِ نظر تصنیف "مفتاح الحکمت" کے مطالعے کی سعادت نصیب ہوئی، جو مختلف فکر انگیز ابواب پر مشتمل ہے۔ نصیرؔ ہونزائی کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھنے کیلئے یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ کائنات کی اشیاء، اجسام اور آیات کے ظہور و بطون اور پیدا و پنہاں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جب تک ہم ظاہر اشیاء و آیات کی نقاب ہٹا کر حقیقت الحقائق کا مطالعہ نہ کریں گے نہ اسرارِ حیات کو سمجھ سکتے ہیں نہ رموزِ کائنات کو۔ کتاب مفتاح الحکمت کی تحریر و انشاء کا مفہوم و مقصد سمجھنے سے قبل مصنّف ممدوح

کے علمی نقطۂ نظر کو سمجھ لیا جائے تاکہ ادراکِ حقائق میں التباس واقع نہ ہو۔ میزان الحقائق کے دیباچے میں نصیرؔ ہونزائی نے لکھا ہے کہ:

"خدا کی مقدّس کتاب خدا ہی کی روشنی میں پڑھی اور سمجھی جاسکتی ہے، یہی ہے وہ اوّلین شرط جو خود قرآنِ حکیم نے واضح کر دی ہے، اگر ہم سے ایسا نہ ہو سکا تو زمانۂ حاضرہ کا کوئی مسئلہ بھی ہم سے حل نہ ہو سکے گا، جس کی حجّت ہم پر ہی رہے گی نہ خدا پر، کیونکہ اس کا فرمان ہے کہ اسکی نعمت ہم پر پوری ہو چکی ہے اور دینِ اسلام میں اللہ نے کوئی حرج نہیں رکھا ہے۔"

مسودۂ کتاب مفتاح الحکمت حسبِ ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) شرح دیباچۂ وجہ دین (۲) تاویلِ استرجاع (۳) آیۂ اطاعت (۴) تحقیقاتِ معجزات (۵) انسانِ کامل کی جسمانی معرفت (۶) جشنِ نوروز (۷) آسمان سے باہر کیا ہے؟ (۸) روحانی مجلس (۹) تاویلِ سورۂ کوثر (۱۰) طریقِ استعانت (۱۱) سیاروں میں انسان کی سیاحت (۱۲) کیا آسمان و زمین سات اور سات چودہ ہیں؟

کتاب کے ساتویں باب (آسمان سے باہر کیا ہے؟) میں مصنّف نے ترکیبِ عالم پر اِن الفاظ میں روشنی ڈالی ہے کہ: "پھر اگر کوئی پوچھے کہ اس فلکِ اعظم (فلکِ محیط) سے باہر کیا ہے، تو جواب دو کہ جسمِ کُلّی (فلکِ اعظم یا فلکِ محیط) کے بعد اور کوئی جسم نہیں یعنی نہ فضا ہے اور نہ خلا، بلکہ خلائے موہوم (وہمی خلا) ہے اور حقیقت میں وہ حدِّ لامکان ہے، یعنی وہ کوئی جسمانی جگہ نہیں، کیونکہ وہ دائرۂ روح کی حدّ ہے یعنی روحِ کُلّی کا حصار، جس پر کُلّ کائنات کا قیام ہے۔"

ترکیبِ عالم کی یہ تشریح مصنّف کے فلسفیانہ شعور اور اندازِ نظر کی مظہر ہے۔ جناب نصیرؔ ہونزائی "بُرُشسکی" زبان کے قادر الکلام شاعر ہیں اور لطف یہ کہ اردو میں بھی نہایت حسن و رعنائی کیساتھ شعر کہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اردو نثر و نظم، دونوں

ان کی تحقیقی کاوشوں اور تخلیقی کوششوں سے بہرہ مند ہوتی رہے گی۔ وہ سرزمینِ ہونزہ کے گلِ سرسبد ہیں اور میں انہیں کے الفاظ میں ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ:

همّت و عزمِ امورِ شان زخارا سخت تر
صلحِ کل را معنیٔ شیر و شکر ہونزائیان

دل کشانِ اہلِ دانش از رہِ مہر و وفا
با کمالِ حسنِ سیرت جلوہ گر ہونزائیان

شعرِ دل خواہِ نصیر آئینۂ آئندۂ
کاندران با کامِ دل باکرّ و فر ہونزائیان

فقیر
(سید محمد مہدی الحسینی) رئیس امروہوی
۲۱ مئی ۱۹۶۵ء ، جمعۃ المبارک ۱۹ محرم ۱۳۸۵ھ

تقریظ

(وزیر غلام علی الانہ)

میں نے فاضلِ مُحترم جناب نصیر ہونزائی کی گرانقدر تصنیف "مفتاح الحکمت" دیکھی اور اس کے فکرانگیز مباحث سے استفادہ کیا، میں فاضل موصوف کے علمی اور فکری خلوص کا قائل رہا ہوں، اور اُن سے مختلف مسائل پر گفتگو کی ہے، نصیر صاحب کی علمی اور فکری تحریریں باطنی فلسفے کا بیش بہا منظر رکھتی ہیں۔ باطنی فلسفے نے مسلم ثقافت کو ایک گہری معنویّت دینے میں جو کردار ادا کیا ہے، اس کا ابھی پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا، اس مکتبۂ فکر نے دنیائے اسلام کے عظیم ترین ذہنوں کی تربیت کی ہے، اور اسلامی مشرق کے دوسرے فلسفیانہ مکاتب کو مختلف سطحوں پر متاثر کیا ہے، حمید الدّین کرمانی، المویّد فی الدّین شیرازی اور ناصر خسرو ایسے زعمائے فکر اسی عظیم الشّان مکتبۂ فکر کے پروردہ ہیں، دنیائے اسلام کی شہرۂ آفاق تنظیم "اخوان الصّفا" مکتبۂ باطنیت ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

فاضلِ مُحترم جناب نصیر ہونزائی نے اپنی گرانقدر تصنیفات میں اِس نظامِ فکر کی نمائندگی کی ہے، اور اُن حقائق کو زیرِ بحث لائے ہیں، جو آج تک دقیق فکر کا موضوع بنے ہوئے ہیں، ان کی زیرِ نظر تصنیف "مفتاح الحکمت" بھی اِسی ذیل میں آتی ہے، انہوں نے اس کتاب میں براہِ راست قرآنِ کریم کے حوالے سے بعض مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اُنکی یہ کوشش علمی اور مذہبی حلقوں

میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

وزیر غلام علی الانہ

تعارف

(شیر علی اختر ایم ۔ اے)

کیا ہم واقعات و حادثات کی مخلوق ہیں یا ہمارا کوئی ازلی خالق بھی ہے ؟ اس زندگی کی حقیقت کیا ہے (جو ہمارے دائرۂ عقل و شعور میں مروّج ہے) کیا لامحدود عرصے تک یہ حیاتِ انسانی قائم رہ سکتی ہے، یا یہ سب کچھ واہمہ ہے سراب ہے ؟ کیا ہم چند ارب خلیوں اور کیمیاوی طبعی توانائیوں کا مجموعہ ہیں یا یہ امرِ واقعی ہے کہ ہم یہ سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود اپنے وجود اور انانیت کی نفی نہیں کر سکتے، اور اسی دلیل سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ یہ شعورِ انانیت اور شعورِ مکان و زمان کسی محرّکِ اوّل اور عقلِ اوّل کی نشاندہی کرتا ہے ۔

یہ کہنا کتنا صحیح ہے کہ انا اور وجود کو جب اپنی ہستی پر اصرارِ قطعی ہے اور جب کہ اسکی نفی موت ہے اور اسکا اثبات ہی حیات ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ زمان و مکان کا محرّکِ اوّل خود کو اثبات و اظہار سے بے نیاز کر کے عدامیت میں چھپا لے گا ۔ کیا اثباتِ ہستی کا دوسرا نام مذہب نہیں ہو سکتا ؟ کیا تحریک و اظہار اس کی عبادت نہیں ہو سکتی اور اس کے تمام اضداد و منفیات کفر و الحاد نہیں ہیں ؟ اگر ہم اس نظر سے مذاہبِ عالم کا مطالعہ کریں تو شاید عقل کو خبر کا ماحصل صحیح انداز سے میسّر ہو سکے گا، اور یہ عقدۂ حیات ہم پر شعوری طور پر وا ہو جائے گا ۔

مذاہبِ عالم میں اسلام بابِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، مختلف مذاہب میں

انبیائے کرام اور خصوصاً مسلمان صوفی حضرات نے اپنی جس حدِ نظر کا اظہار کیا ہے اس کی وسعت انتہائی عظیم اور تابناک ہے۔ "اُن دانایانِ راز" انسانوں میں ایک طبقہ ان اہلِ نظر کا بھی ہے جو اپنے فہم و فراست سے ان علمی خزانوں کی نشاندہی کرتا آیا ہے جو مذہبِ اسلام نے ہر دور کے انسانوں کیلئے لٹائے ہیں، حضرت امیر ناصر خسروؒ، اپنے وقت کے چند بلند پایہ حکماء اور صوفیاء میں سے تھے، جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہوں پر حقائقِ ابدی کی تلاش میں بے پایان منزلیں طے کیں اور اپنے علم کے ذریعہ اُن منازل کی نشاندہی کی۔

مصنّف کی موجودہ کاوشِ فکری میں حضرت حکیم ناصر خسروؒ کے عظیم فلسفۂ امامت اور حقیقت کا بڑا گہرا اثر ہے، اسکے ساتھ ساتھ مصنّف کا وہ ذریعۂ استدلال بھی ہم رکاب ہے، جس کی بنیاد پر موجودہ دور کی سائنسی تحقیقات کی اساس ہے، روح اور مادّہ کی ہم آہنگی کی جو کوشش مصنّف نے "جوہری توانائی" کے ضمن میں کی ہے وہ کسی حد تک اہلِ نظر و فکر کو اپیل کرتی ہے، اسکے ماورا بھی ایک اور مذہبی، اسلامی اور قرآنی رنگ نمایان ہے، جس نے مصنّف کی اپنی شخصیت کو ابھارا ہے اور ایک ایسا مقام پیدا کیا ہے، جو دوسرے اہلِ فکر کو آگے چل کر مذہب اور مادیت کو ایک ہی وحدت میں مُرتسم کرنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

شیر علی اختر ایم۔اے

اظہارِ تشکّر

میں اپنی اس تصنیف کے سلسلے میں جناب فاضل رئیس امروہوی صاحب، جناب عزّتِ مآب وزیر غلام علی الانہ صاحب اور جناب شیر علی اختر صاحب ایم۔اے، کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ اِن تینوں حضرات نے اپنی گوناگون مصروفیات کے باوجود اپنے بیش بہا وقت کا ایک حصّہ وقف فرما کر نہ صرف اس کا سرنامہ اور تعارف تحریر فرما کر علم گستری اور دانش پروری کا ثبوت دیا بلکہ اپنے عالمانہ و فاضلانہ آراء سے بھی مستفید فرماتے ہوئے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہمّت افزائی اور تعاون فرمایا۔

اس کے علاوہ میں اراکین "دارالحکمۃ الاسماعیلیہ ہونزہ گلگت" اور ان دیگر تمام معاونین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے دینی اور علمی ترقی کی خاطر مالی قربانی دے کر اس کی طبع و اشاعت کے وسائل فراہم کئے۔

نصیرؔ ہونزائی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ دیباچۂ وجہِ دین

اسی خالقِ برتر و توانا کی تعریف و توصیف ہے جس نے عالمِ باطن سے عالمِ ظاہر پیدا کرتے ہوئے اسمیں اسکے آثار دکھائے تاکہ لوگوں کو اِن آثار کے مشاہداتی دلائل سے خدائے تعالیٰ کی حقّانیّت و یگانگت کی معرفت کا راستہ پیدا ہو کر انہیں یقینِ کامل حاصل ہو جائے اور وہ یہ کہہ سکیں کہ ہمارا خداوند حق ہے، چنانچہ کلامِ پاک کی ایک آیت سے یہی حقیقت ظاہر ہے کہ: "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ" (۴۱: ۵۳) "ہم ان کو اس عالم میں اور ان کی جانوں میں اپنے آثار دکھاتے رہیں گے یہاں تک کہ انہیں ظاہر ہو جائے کہ وہ حق ہے۔"

پھر حکیمِ مطلق نے انسانی عقل کو یہ نایاب موقع عطا فرمایا کہ وہ انہی نشانیوں کی تحقیق و تدقیق میں اپنا جلوہ و جوہر کا مظاہرہ کرے تاکہ عقل اپنی اس فضیلت و مرتبت کی بنا پر دوسری تمام چیزوں سے ممتاز ہو سکے۔

خدائے قدّوس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے بذاتِ خود قائم رہنے والی چیز (جوہر) کو بذاتِ غیر قائم رہنے والی شے (عرض) میں چھپائے رکھا، چنانچہ عناصرِ اربعہ یعنی مٹی، پانی، ہَوا اور آگ کی گرمی، سردی، خشکی اور تری میں ایک جوہر کو سموئے رکھا، جس کو بفرضِ محال اگر ان سے جُدا کیا جائے تو عناصر ختم ہوں گے،

لیکن یہ جوہر ان کے بغیر بھی قائم رہ سکے گا، جوہر و عرض کی یہی مثال ہے۔

صانعِ حکیم نے انسانی اجسام کو روحِ ناطقہ کے قابل بنایا، جو اجرامِ فلکی، عناصر، معدنیات، نباتات، حیوانات وغیرہ کے بعد پیدا ہوئے، کیونکہ ان نامبردہ چیزوں کے ترتیبی عمل کے نتیجے سے انسانی اجسام بنتے ہیں، اور جسم کو روح سے متّصل کرنے کی غرض یہ ہے، کہ ہر دانشمند چشمِ بصیرت سے یہ مشاہدہ کرے، کہ روح ایک جوہرِ توانا ہوتے ہوئے بھی ناتوان جسم (عرض) کی محتاج ہے، جسکی وجہ یہ ہے کہ جسم کے بغیر روح کا مقصدِ حیات حاصل ہو نہیں سکتا، بنابرین کوئی دانا انسان لطیف شئ کو کثیف سے بے نیاز نہ سمجھے، جسطرح کثیف کی حاجتمندی لطیف سے وابستہ ہے، یعنی جو چیز اپنا کوئی جسم نہیں رکھتی ہو وہ کسی جسم والی شئ کی محتاج رہتی ہے۔

باری سبحانہٗ جو متضاد (اضداد) چیزوں کی جوڑی (جفت) بنانے والا ہے، ایک وجہ سے ان صفات سے بھی پاک ہے، جو بدلیلِ عقل کسی دوسری شئ کی متضاد یا جُفت تصور کی جاسکتی ہوں، کیونکہ جُفت ضدّین کا نام ہے، یعنی دو برعکس چیزیں جُفت یا جوڑی کہلاتی ہیں، جس طرح دن رات، نزدیک و دور، زیادہ و کم، سفید و سیاہ، خیر و شر، عادل و ظالم وغیرہ، پس بحقیقت خدا کی کوئی ایسی صفت نہیں جس میں کوئی ضدّیت پائی جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مخلوقات میں سے ہر ایک چیز پہچانی جانے کیلئے اپنی ضد کی محتاج ہے، لیکن خدائے پاک نہ کسی چیز کا محتاج ہے نہ اس کی صفات میں کوئی ضدّیت پائی جاتی ہے، چنانچہ تختۂ سیاہ پر سفیدی سے اور سفید کاغذ پر سیاہی سے لکھا جاسکتا ہے اور تمام اضداد کی بھی یہی مثال ہے جن کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: "تُعرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا"، "چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں"۔

اب ہر دانشمند انسان چشمِ بصیرت سے دیکھ سکتا ہے کہ قرآنی حقیقت کے ساتھ اس بیان کی موافقت و مطابقت کس حد تک ہے، فرمانِ ایزدی: "سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ مِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ" (۳۶:۳۶) "پاک ہے وہ ذات جس نے ساری چیزوں کو جفت جفت پیدا کیا، نباتات سے، ان کی جانوں سے اور ان چیزوں سے جنہیں وہ نہیں جانتے ہیں۔"

قرآنِ حکیم کے لاتعداد کمالات و معجزات میں ایک یہ بھی ہے کہ جس آیت میں خدا کا کوئی نام آئے وہی آیت اسی نام کے باب میں متعلقہ تشریح کی حیثیت رکھتی ہے، مگر اس کے باوجود آیت کا ظاہری موضوع نہیں بدلتا، اسی طرح اسی آیۂ مبارکہ میں عقلانی، روحانی اور جسمانی ساری چیزوں کو جفت جفت پیدا کرنے کے ذکر کیساتھ ساتھ اسم "سبحانٌ" کی تشریح بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسم "سبحانٌ" ذاتِ یگانہ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، جس کے مرادی معنی یہ ہیں کہ خدا اپنی ان عقلانی، روحانی اور جسمانی مخلوق کی مانندیت اور صفت سے پاک ہے جنکو اس نے جفت جفت پیدا کیا، کیونکہ ان چیزوں کی صفات میں ضدّیت ہے اور اسی ضدّیت کی وجہ سے وہ جفت جفت پیدا ہوئی ہیں، مثلاً دن اور رات جفت ہیں، اب دن جتنا بڑھے گا رات اتنی گھٹے گی، اور رات جتنی بڑھے گی دن اتنا گھٹے گا، خیر جس قدر زیادہ ہوگی، شرّ اس قدر کم ہو گا اور جب شرّ میں اضافہ ہو جائے تو خیر میں کمی آئے گی۔ اس دلیل سے ظاہر ہے کہ خدا کی کوئی متضاد صفت نہیں۔

درود ہو خدا کے اس برگزیدہ رسول پر، جو عرب و غیر عرب کے سارے لوگوں میں سے حد درجہ کی فصاحت و بلاغت رکھتا ہے جس پر وحی نازل ہوئی، یعنی نفی و اثبات جسکی ہمہ رس ہدایت، تفصیلی وسعت اور معنوی جامعیّت اس امرِ واقعی

سے عیاں ہے کہ وہ ایک مقدّس کتاب کی صورت میں آئی، جسے قرآنِ حکیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، بعینہٖ یہی نفی و اثبات ایک کلمہ میں بھی نازل ہوا، اسی طرح اپنی صوری و معنوی شمار و مقدار کی کمالیّت و تمامیّت کے ساتھ ایک بزرگ ترین اسم یا حرف میں بھی، اور تمام پیغمبران اور امامانِ حقؑ کی زبانِ مبارک پر بھی یہی مقدّس چیز جاری رہی۔ پس انبیاء و اولیاءؑ نے لوگوں کو جو پیغام سنایا اور جو حقائق بیان کئے یا اب جو سلسلۂ ہدایت جاری ہے وہ گویا آنحضرتؐ کا پیغام ہی ہے، جسے خدائے تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ اس بیان کا واضح خلاصہ یہ ہوا کہ نفی و اثبات یا قرآنِ پاک، کلمہ یا اسمِ اعظم وغیرہ کے نام سے آنحضرتؐ کو جو حقیقت ملی تھی، بحیثیتِ مجموعی ایک زندہ نور ہے، اور یہ نام جن کا ذکر ہوا اس نور کے کارنامے ہیں، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: "وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (۴۲:۵۲) "اور اسی طرح ہم نے اپنے امر سے تیری طرف ایک روح بحیثیتِ وحی بھیجی ہے تو اس سے پہلے نہیں سمجھتا تھا کہ کتاب (کائنات) اور ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس روح کو نور بنایا ہے ہم اپنے بندوں میں سے جن کو چاہیں اسی نور کے ذریعے راستہ دکھاتے ہیں۔"

دُرود ہو حضرت محمّد مصطفٰےؐ کے مبارک نام پر، جو خدا کی کائناتی کتاب اور اس کے دین کا ترجمان، قرآنِ پاک کی زبان اور شرائع انبیاء کا اوّلین بانی ہے، اس کے نورانی، جوہری (ذرّوی) جسم پر رحمتِ الٰہی نازل ہو، جو خاکی جسم کا خلاصہ مگر اس سے آزاد ہے، اور گرمی، سردی، خشکی اور تری کی ترکیب سے مبرّا ہے، وہ بیک وقت مرئی بھی ہے اور مغیب بھی، اسلئے کہ وہ جثّۂ لطیف و فلکی ہے۔

امام علیؑ المرتضیٰؑ سرِّ خدا کی جانِ پاک پر رحمتِ ایزدی نازل ہو، جس کی ذاتِ شریف علوم و معارف کا ایک ایسا بے پایان خزانۂ امانت ہے کہ اگر کوئی فردِ بشر اپنے علم و معرفت کا حصّہ اپنی سعی و کوشش سے حاصل کرنا چاہے تو ناممکن نہیں ہے بلکہ بالکل اسی حالت میں حاصل کرسکتا ہے جس حالت میں خدا و رسول نے ہر شخص کیلئے اس کی دَوری اور مقامی ضروریات کے پیشِ نظر اس کا علمی حصّہ اس گنجِ علم و حکمت میں بطورِ امانت رکھا ہے اور رحمتِ خداوندی ہو نبی و علی کی آل پر جو دنیا و آخرت کے فرشتگانِ جلالی ہیں اور یہ اس حقیقی راستے کے رہنما ہیں جس کو صراط المستقیم کہا جاتا ہے جس کی منزلِ مقصود وہی گنجِ علم و حکمت یعنی علیؑ المرتضیٰؑ ہے، جن کے بارے میں رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ: "یَا عَلِیُّ اَلصِّرَاطُ صِرَاطُکَ وَالْمَوْقِفُ مَوْقِفُکَ"۔ یعنی "اے علی صراط المستقیم تیرے راستے کا نام ہے، اور منزلِ آخرین بھی تیری ہی منزل ہے"، جہاں لوگوں کو روحانی آسائش و امن میسّر ہوتا ہے۔

والسّلام

تاویلِ استرجاع

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲:۱۵۶)

حضرت حکیم ناصر خسروؒ کتاب وجہ الدّین میں فرماتے ہیں کہ لوگوں کو جسمانی حالت میں مصیبت اور مشکلات آتے وقت اس قول کا کہنا واجب ہے، جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: "اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" (۲:۱۵۶) "وہ لوگ جن پر جب کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں۔" عرب والے مشکل کاموں کو رات کی تاریکی سے تشبیہہ دیتے ہیں، اس لئے کہ اس کام سے بڑھ کر اور کوئی مشکل نہیں، جسکے گھیرے سے نکل جانے کا راستہ ہی لوگوں کو نظر نہ آئے۔ یہی تو تاریکی ہے، تاریکی دو طرح کی ہے: جسمانی اور روحانی، جسمانی تاریکی کی وجہ رات ہے جسے سورج ہی روشن کرسکتا ہے، کیونکہ جسمانی تاریکی اسی سے روشن ہوسکتی ہے اور وہ جسمانی رکاوٹوں کو ختم کر ڈالتا ہے، لیکن روحانی تاریکی نادانی اور معقولات کے مشکل مسئلے ہیں، اس قسم کی تاریکی کے لئے روشنی خدا سے ہے، جو اساس کی وساطت سے آتی ہے، اس کے بعد روحانی ظلمت میں چشمِ باطن (بصیرت) کا سُورج امامِ زمان ہے جس کے سہارے ایسے سخت عقدے کھل جاتے ہیں، جب

کوئی جسمانی ظلمت (مصیبت) اور سختی کسی کے سامنے آئے تو اُسے واجب ہے کہ مشیّتِ ایزدی کے لئے راضی ہو جائے اور جو کچھ اس کے لئے حکم ہوا ہو اُسے قبول کرے، اور کہے: "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔" یعنی ہم خدا کے ہیں اور ہم نے قبول کیا جو کچھ اس نے حکم کیا ہو، اگر ان مشکلات سے ہمیں کوئی ایسی جسمانی تکلیف پہنچے جس کی وجہ سے ہم جسمانی طور پر مر جائیں تو اس صورت میں ہم اسکی طرف واپس ہونے والے ہیں اور تاویل میں مومن کو واجب ہے کہ جب معقولات کا کوئی ایسا مسئلہ اس کے سامنے آجائے جس کو وہ حل نہ کر سکتا ہو، تو پھر اسی قول کو دہرائے اس طریقہ پر کہ "ہماری جانیں صاحب العصر کی ہیں کیونکہ ہمیں روحانی زندگی اسی سے ملی ہے اور مشکلات میں ہم اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں" اور وہ مومن یہ سمجھے کہ "ہم اس مشکل مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے ہیں، اس کا علم صاحبُ العصر کے پاس ہے" تاکہ اس کیلئے روحانی فیض کا دروازہ کھلے، اور ان مشکلات کو سمجھ سکے، تاکہ حدودِ دین میں سے ایک حدّ اُس دروازے کو اِس کیلئے کھول دے گا اگر ایسی مشکلات حدودِ دین کے کسی ایک حدّ کے سامنے آئیں تو اُسے چاہئے کہ تائید (روحانی امداد) کا مادّہ (وہ روح جو ایٹم یعنی ذرہ پر سوار ہے) خداوندِ زمانؑ سے طلب کرے تاکہ اپنے اس قول کے کہنے سے کوشش کر سکے گا، اور وہ غیب اس پر کھلے گا، اور اگر کھل نہ جائے تو یہ اپنی ہی کمزوری سمجھے اور اقرار کرے کہ جو شخص ایسی مشکلات کا چارہ جانتا ہو اسے یہ زیب دیتا ہے کہ روحانی مشکلات میں لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور یہ صرف مومن کیلئے ایک شفا بخش بیان ہے۔

والسّلام

آیۂ اطاعت کی تفسیر

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلاً" (۵۹:۴)۔

"اے ایمان والو! تم اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اوراولوالامر کی فرمانبرداری کرو جو تم میں سے ہیں، پھر اگر کسی مسئلے میں باہم اختلاف کرنے لگو، تو اُسے اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف دوبارہ لے جاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ (طریقہ) اچھا ہے اور تاویل کی جہت سے بہترین ہے۔"

آیتِ مذکورہ میں خدا کی اطاعت یعنی عمل بالقرآن کے بنیادی اصول کے متعلق ایک مختصر مگر جامع تعلیم دی گئی ہے اور اس میں حقیقی فرمانبرداری کا وہ واحد وسیلہ بتایا گیا ہے جسکی صحیح تفہیم و تعمیل کے بغیر اطاعت کا حق صحیح معنوں میں کسی سے ادا ہو نہیں سکتا اور اس میں وہ وجوہ بھی مرموز ہیں، جن کی بنا پر بمقتضائے زمانہ اطاعت کو تین مراتب میں بیان کیا گیا ہو یعنی اطاعتِ خدا، اطاعتِ رسول اور اطاعتِ اولوالامر، یہ وجوہ از روئے حکمت بالترّتیب قرآن کی تین قسم کی آیات ہیں یعنی آیاتِ مفصّلات، آیاتِ مجملات اور آیاتِ متشابہات، اب اطاعت کے تین مراتب کی ذیل میں تشریح کی جاتی ہے۔

اطاعتِ اللہ سے مراد اُن آیات کی فرمانبرداری ہے جو مفصّل ہیں اور جن میں سنّتِ الٰہی سے لوگوں پر گزرے ہوئے واقعات کی عبرت، نظامِ کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت اور مخلوق کے فطری حقوق کے تحفظ کے اٹل قوانین ہیں، اطاعتِ رسول سے مراد اُن آیات کی فرمان برداری ہے، جو مجمل ہیں اور جن کی رسول نے اپنے قول و فعل کے ذریعے تفصیل کی اور امت کو دکھایا، یہ آیات اگرچہ لفظی لحاظ سے مختصر ہیں، لیکن از روئے حکمت ان میں کئی رموز سربستہ ہیں اور یہ زمانے کے تقاضے کے مطابق تشریح طلب ہوتے ہیں، چنانچہ رسول نے جو کچھ اپنے قول و فعل کے ذریعے تشریح فرمائی ہے، وہ زمانے کے تقاضے کے موافق تھی، اطاعتِ اولوالامر سے مراد اُن آیات کی فرمانبرداری ہے، جو متشابہ ہیں اور جن کی تاویل اولوالامر ہمیشہ اپنے اقوال و اعمال سے کرتے رہتے ہیں، ان حکمت آگین آیات کی معنوی وسعت کا یہ عالم ہے کہ عالمِ روحانی و جسمانی کے متعلق "مَاکَانَ وَمَایَکُونُ" (جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوگا) کے تمام علوم ان میں سموئے ہوئے موجود ہیں، بالفاظِ دیگر ان میں خلق اللہ کی لاانتہا عروج و ارتقاء کی کُلّی اور تدریجی ہدایت موجود ہے۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ لفظ "مِنْکُمْ" سے کونسی نسبت مراد ہے جو اولوالامر اور اہلِ زمانہ کے مابین پائی جاتی ہے؟ تو اس کے جواب کیلئے ہمیں مذکورہ آیت پر غور کرنا پڑے گا، پس آیتِ مذکورہ میں اللہ اور رسول کے ذکر کے ربط سے ظاہر ہے کہ یہ نسبت اہلِ زمانہ اور اولوالامر کے درمیان سلسلۂ اولوالامر کی دائمی ہم عصریت کی ہے گویا خداوند برتر امّتِ محمّدی کے جملہ معاصرین سے بیک وقت فرما رہا ہے، کہ سلسلۂ اولوالامر ظہور اور زمانہ کے اعتبار سے تمہارے درمیان قیامت تک قائم و دائم چلا آرہا ہے، تم اس سلسلۂ اولوالامر کی اطاعت

کرو، جس کا مطلب یہ ہے، کہ ہر عصر والے صرف اپنے ہی صاحبُ الامر والعصر کی فرمان برداری کریں۔

بعدازین "فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ" کی تحقیق ضروری ہے یعنی یہ معلوم کرنا ہے، کہ یہ تنازع حقیقی صاحبِ امر کی پہچان سے متعلق کسی مسئلے میں ممکن ہے؟ یا اسکی فرمانبرداری کرتے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تنازع حقیقی صاحبِ امر کی پہچان کے مسائل میں ممکن ہے اوراس کی حقیقی فرمانبرداری میں یہ تنازع ناممکن ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اگرچہ خدائے واحد کی اطاعت رسائی کے اعتبار سے تین درجات میں تقسیم کی گئی ہے، جن کا ذکر ہو چکا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی اطاعت ہے، وہ اسطرح کہ اولوالامر کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، بدین دلیل ہر زمانے کے صاحبُ الامر کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اور خدائی اطاعت کے معنی خدائی ہدایت پر عمل کرنے کے ہیں اور خدائی ہدایت پر عمل کرنے کا حاصل نورِ علم ہی ہے، پس خدائی ہدایت یعنی نورِ علم میں جو خدائے تعالیٰ کی اس بالواسطہ اطاعت (صاحبِ امر کی فرمانبرداری) سے بالیقین حاصل ہو سکتا ہے، ایسا کوئی تنازع ناممکن ہے نیز اگر ہم یہ فرض کریں، کہ یہ تنازع اولوالامر کی فرمانبرداری کی صورت میں ہو سکتا ہے تو گویا اس کی مثال ایسی ہوگی، کہ ہمارے دینی اور دنیوی مسائل کے اولوالامر جو حل یا فیصلہ فرما دیں، اس کو ہم اپنی عقلِ ناقص کے معیار پر پرکھنے کے مجاز ہیں بالفاظِ دیگر گویا خدا سے ہمیں اس امر کی اجازت ملی ہے، کہ اگر اولوالامر کا کیا ہوا فیصلہ یا حل ہماری عقولِ ناقصہ کے لئے قابلِ قبول نہ ہوا تو ہم خود ہی خدا و رسول کیطرف رجوع کریں یعنی اپنی عقلِ جزوی ہی کی سعی و کوشش کے ذریعے قرآن و حدیث سے ان مسائل کا حل ڈھونڈیں، پس ظاہر ہے کہ یہ امر ناممکن ہے۔

مذکورہ بالا مدلّل بیان سے جب یہ حقیقت عیاں ہوگئی، کہ تنازع اولوالامر کی فرمان برداری کی صورت میں ناممکن ہے تو اسکے برعکس یہ تنازع اولوالامر کی پہچان کے متعلق پیدا ہوتا ہے اور مسلسل تاریخی واقعات بھی اس دعوے کی حقانیت کی تصدیق کرتے ہیں۔

چنانچہ مقدماتِ مذکورہ بالا کی روشنی میں آیتِ اطاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! تم آیاتِ مفصّلات میں اللہ کی فرمانبرداری کرو، آیاتِ مجملات میں رسول کی فرمانبرداری کرو اور آیاتِ متشابہات میں اولوالامر کی فرمانبرداری کرو، جو تم معاصرین میں سے ہیں، پھر اگر ہمارے مقرر کردہ اولوالامر کی پہچان کے متعلق کسی مسئلے میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ تعالیٰ اور رسول یعنی قرآن و حدیث کیطرف دوبارہ لے جاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ طریقہ اچھا ہے، بہ نسبت اس کے کہ تم اس تحقیق سے باز رہو، اور تاویل یعنی امرِ متشابہ کو حالِ اوّل کی طرف لے جانے کے لحاظ سے بھی یہ بہترین ہے، بہ نسبت اسکے کہ تم کسی دوسرے شخص کی کتاب و روایت کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرو۔

حکیمِ مطلق یہ سب کچھ جانتا تھا، کہ "اولوالامر" کے نام سے بادشاہِ وقت یا حکّامِ زمانہ وغیرہ بھی مراد لئے جاسکتے ہیں، پس تکمیلِ ہدایت اور اتمامِ حجّت کی غرض سے علیم و حکیم نے مذکورہ آیۂ اطاعت سے پیشتر ہی اسلامی حکومت کی دو بھاری شرائط کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے نہ صرف سلاطین و حکّامِ اسلام کو اولوالامر سے علیحدہ ثابت کرکے دکھایا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، کہ دینی امور میں مسلم سلاطین و حکّام کو اولوالامر کی اطاعت کرنی چاہئے، چنانچہ خدائے قدّوس فرماتا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا۔"

(۵۸:۴)

"یقیناً اللہ تعالیٰ تم کو امر کرتا ہے کہ تمہارے پاس جن کی امانتیں ہیں انہیں دے دیا کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم کرو تو عدل سے حکم کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہے، وہ اچھی ہے، بلاشک اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔"

اب ہمیں اس حقیقت کا انکشاف کرلینا چاہیئے کہ مذکورہ بالا آیت کا اصلی موضوع کیا ہے؟ اور امانت و عدل کے ان دونوں امور کا خاص تعلق کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ پس اگر کوئی دانشمند چشمِ بصیرت سے اس آیت میں دیکھے تو یقینی طور پر اُسے یہ حقیقت معلوم ہوگی، کہ اس آیۂ کریمہ کا اصلی موضوع دینِ اسلام کے سلاطین، حکّام اور صاحبانِ اقتدار کی ضروری اور بروقت تعلیم ہے، جسمیں ہر اسلامی حکومت کیلئے خدا کی طرف سے مقرر کردہ دو ایسے بنیادی اصول بتائے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے میں حکومت کی ترقی، کامیابی اور لازوالی مضمر ہے اور جن کی خلاف ورزی کرنے میں خدا و رسول کی ناراضگی اور اس کے نتیجے میں ابدی نامرادی پوشیدہ ہے۔ اسلامی حکومت کے یہی دو بنیادی اصول خدا کیطرف سے حکومت کے مجاز ہونے کی دو بھاری شرائط بھی ہیں اور بعد ازان بحیثیتِ اسلامی حکومت کے دو عظیم دینی فرائض بھی، غرض آنکہ ان دونوں میں اسلام کی عالمگیر ترقی کیلئے سب سے ضروری اور بنیادی ہدایات موجود ہیں۔

پس آپ ذرا تأمّل اور دقّت سے دیکھئے کہ اس آیۂ امانت و عدالت میں کیسے جامع حقائق پوشیدہ ہیں! اور تحفظِ حقوق کے متعلق اس میں کیسے عظیم اسرار

موجود ہیں! پس اس حقیقت کے انکشاف کا طریقہ یہ ہے، کہ مذکورہ آیۂ مبارکہ میں امّت کے تین بڑے گروہوں کا ذکر موجود ہے، اور یہ گروہ علی الترّتیب آلِ محمّد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم، حکّامِ دینِ اسلام اور امّتِ محمّدی کے عوام ہیں، گروہِ اوّل کا اثبات "اُن کی امانتیں انہیں حوالہ کرنے" کے امر سے ظاہر ہے، کیونکہ وہ گروہ اس امر سے مستثنٰی صرف اسلئے ہے کہ اسکے پاس کسی کی کوئی امانت نہیں، اور اگر اسکے پاس بھی کسی کی کوئی امانت ہوتی، تو اندریں حال حکیمِ مطلق یوں فرما دیتا کہ "تم آپس کی امانتیں ایک دوسرے کے حوالے کیا کرو" جسطرح اللہ تبارک و تعالٰی سورۃُ الانفال کی ۲۶ تا ۲۷ آیت میں بطریقِ نہی یہ ارشاد فرماتا ہے کہ: "تم آپس کی امانتوں میں خیانت نہ کرو۔"

اس حقیقت کی دوسری دلیل (کہ جن کی امانات کا یہاں ذکر ہے، وہ نہ تو حکّام ہیں اور نہ عوام، بلکہ وہ آلِ رسول ہیں) یہ ہے کہ وہ ان عوام میں سے نہیں، جنکے حقوق کا ذکر عدل کے عنوان کے تحت آیا ہے، کیونکہ وہ آلِ رسول یعنی امامانِ حق ہیں اور ان کے حقوق کا ذکر بحیثیتِ عدل کے عنوان کے تحت نہیں آتا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ وہ اولوالامر یعنی خدا کے امرِ مجسّم ہیں، اور امرِ خدا حاکم کے حکم اور اسکے عدل سے بالاتر ہے، پس انکے حقوق میں ظلم و عدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ خدائے برتر نے اولوالامر کے حقوقِ اطاعت کا نام امانت رکھا، کیونکہ امانت ان کی اطاعت کی مثال ہے اور خیانت ان کی نافرمانی کی مثال ہے، اب یہ معلوم کرنا ہے، کہ کیا! اولوالامر اور حکّام دونوں گروہ کو یکجا طور پر یہ ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ جب تم لوگوں کے درمیان حکم کرو تو عدل سے حکم کرو، اس کا جواب یہ ہے کہ "عدل سے حکم کرو" ایک جامع ہدایت ہے جس میں حقوق دینے اور دلانے کی تمام باتیں آتی ہیں، اندریں صورت امانات کا ذکر کسطرح ممکن ہے؟ کیونکہ اس

مثال میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ لوگوں کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ اس قابل ہے، کہ عدل کرسکتا ہے، دوسرا گروہ ایسا ہے کہ اس کے حقوق عدل ہی سے مِل سکتے ہیں، پس ظاہر ہے، کہ امانات سے مراد اولوالامر کی اطاعت ہے۔

یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے، کہ قرآنی ہدایات کی ترتیب میں بھی بہت سی حکمت موجود ہے، پس اس موضوع کی ترتیب سے جو حکمت اخذ کی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے، کہ عوام کی خوشحالی و ترقی کا انحصار عدالت پر ہے، عدالت کا دارو مدار حکّام کی اہلیت پر ہے، حکّام کی اہلیت کا معجزانہ عمل خدا کی تائید میں ہے، خدا کی تائید اس کی فرمانبرداری میں ہے، اوراس کی فرمانبرداری یہ ہے کہ امانات جن کی ہیں، انہیں دے دی جائیں۔

اس حقیقت کی تیسری دلیل یہ ہے کہ دلائلِ مذکورہ بالا سے یہ حقیقت عیان ہوئی کہ یہ ربّانی خطاب صرف طبقۂ حکّام ہی سے ہے، اندریں حال یہ سوچنا ہے کہ ان حکّام کے پاس کس نوعیت کی امانات ہوسکتی ہیں؟ اوران امانات میں ان سے کس طرح خیانت ہوسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے، کہ یہ مقدس امانات قرآن، حدیث اور فقہ (علمِ دین) کی صورت میں ہیں جو علی الترتیب، خدا، رسول اور اولوالامر کی مقدّس امانات ہیں اوران امانات میں خیانت کرنے کے معنی بعض حکّام کا ان مقدّس امانات کو خلط ملط کرکے اپنے سیاسی اغراض کیلئے استعمال کرنا ہے اور یہ مقدّس امانات خدا، رسول اوراولوالامر کے حوالے کرنے کا مطلب ان کی اطاعت کرنا ہے، جس کی تشریح آیۂ اطاعت میں آچکی ہے، پس معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا آیۂ مقدسہ میں ربّانی خطاب حکمران طبقہ سے ہے، جس کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ حکّام کیلئے خدا کیطرف سے دو قسم کی ایسی نصیحتیں ہونی چاہئیں، جنکی پہلی قسم میں حقوق اللہ کے بارے میں اور دوسری قسم میں حقوق العباد کے متعلق بنیادی اوراصولی ہدایت

ہو، پس اہلِ بصیرت کیلئے یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ اس آیۂ مقدّسہ میں بالکل اسی طرح کی ہدایت ہے، یعنی اس میں حکّام کو سب سے پہلے حقوق اللہ کے بارے میں ہدایت دی گئی ہے، جو مقدّس امانات ہیں، پھر انہیں حقوق العباد کے متعلق آگاہ کیا گیا ہے، جو عدل کے عنوان سے ہے، بعدازان فرمایا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہے، وہ اچھی ہے، یعنی جس قسم کی نصیحت ضروری تھی وہ کر دی گئی۔

چوتھی دلیل یہ ہے، کہ اگرچہ خدا، رسول اور اولوالامر کی مقدّس امانات میں دوسرے تمام انسانوں سے بھی کم و بیش خیانت ہونے کا امکان ہے، جس سے بچنے کیلئے انہیں ایک مجموعی حیثیت کی ہدایت دے دی گئی ہے اور وہ یہ ہے، جو خدائے حکیم فرماتا ہے کہ:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (۸: ۲۷)

"اے ایمان والو! نہ تو اللہ کی خیانت کرو اور نہ رسول کی خیانت کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں خیانت کرو۔ درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔" لیکن اسکا تمام تر تعلق دینی اور دنیوی قسم کے اہلِ اقتدار سے ہے، اسلئے بمقتضائے حکمت ایک موزون ترین مقام پر اس طبقہ کو اس قسم کی خیانت سے بچنے کی ایک جداگانہ ہدایت بھی دی گئی ہے، پس وہ موزون ترین مقام وہی ہے، جہاں پر خدا، رسول اور اولوالامر کی اطاعت اور اسکے متعلق ضروری مسائل کی ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے، تاکہ آیۂ امانت اور آیۂ اطاعت کی باہمی تشریح و تحقیق ہو سکے۔

اب اس سلسلے میں ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ کس طرح مذکورہ مقدس امانات میں خیانت کا زیادہ تر تعلق اہلِ اقتدار سے ہے، پس وہ دلیل یہ ہے کہ قرآنِ پاک انسان کے اقوال و اعمال کی اصلاح کیلئے دو قسم کی تعلیم دیتا ہے

جس میں سے ایک قسم کی تعلیم بطریقِ امر ہے اور دوسری قسم کی تعلیم بطورِ نہی، اسی طرح امانت کے متعلق بھی قرآنِ پاک نے دونوں طریقوں سے تعلیم دی ہے جسمیں سے ایک میں تو یہ بتایا، کہ تم امانات ادا کرو، اور دوسری میں یہ ارشاد ہوا کہ تم خیانت نہ کرو، اب اگر ان تعلیمات میں غور کیا جائے، تو مقدّم الذّکر میں لفظ "حکم" سے حکّام کا نام زیادہ نمایاں ہے، اور مؤخر الذّکر میں لفظ "علم" سے علماء کا نام زیادہ نمایاں ہے، اگرچہ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے جُدا نہیں، پس دانشمند کیلئے اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ قسم کی خیانت کا خاص تعلق دینی اور دنیوی اہلِ اقتدار سے ہے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ اولوالامر کے دینی فیصلے کا نام "امر" اور حکام کے دنیوی فیصلے کا نام "حکم" ہے، چونکہ دینی فیصلہ دنیوی فیصلے کی نسبت برتر ہے اس بنا پر "امر" "حکم" سے ارفع واعلیٰ ہے، چنانچہ آیۂ مذکورہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے لفظ حکم پر امر کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے فیصلے کا نام "امر" اور حکّام کے فیصلے کا نام "حکم" رکھا ہے، جیسا کہ فرمایا ہے کہ (یقیناً اللہ تعالیٰ تم کو "امر" کرتا ہے، کہ تمہارے پاس جن کی امانتیں ہیں، انہیں دے دیا کرو اور جب لوگوں کے درمیان "حکم" کرو تو عدل سے "حکم" کیا کرو۔) لیکن اس کے برعکس جب امامانِ حق کا ذکر آیا تو اس نے ان کو نہ لفظ "اطاعت" میں اپنے سے جُدا رکھا اور نہ لفظ "امر" میں، بلکہ امر کو ان ہی سے مختص کرتے ہوئے ان کا نام "اولوالامر" رکھا، اب لفظ امر کی انتہائی معنوی برتری کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے یعنی ہمیں یہ دیکھنا ہے، کہ وہ کونسی وجہ ہے جسکی بنا پر امامانِ حق کو "اولوالامر" کہا گیا ہے، حالانکہ "امر" بالواسطہ و بلاواسطہ تماماً خدا ہی کا ہے، پھر اس کی اضافت سے رسول اور اولوالامر کا ہے، پس ہم لفظ "امر" کی اس معنوی اہمیت اور اولوالامر کی اطاعت کی ضرورت کے پیشِ نظر ذیل

میں چند ایسے کلمات لکھ دیتے ہیں، جن کی بنا دراصل قرآنی مفہومات ہی پر ہے:

قرآنی رموز و اسرار جوئی کی نشاندہی کے طور پر یہاں لفظ "امر" کی صرف یہی تعریف کافی ہے، کہ لفظ "امر" بحیثیت "قولِ کُلّ" یا بصورت "امرِ کُن" عالمِ الفاظ و اصطلاحات اور جہانِ اشارات و تمثیلات کا وہ انتہائی بیرونی آسمان ہے، جسمیں بحیثیت "امرِ کُلّ" حالاتِ موجودات کے ازلی و ابدی تصوّرات پائے جاتے ہیں، اب ان تصوّرات سے مستفیض ہونے کا تعلق براہِ راست نُورِ خدا کی معرفت سے ہے، اور انہی میں علم و حکمت کے کلیدی اصول کے اسرارِ سربستہ ہیں، کیونکہ "امر" ایک ایسا قرآنی لفظ اور ایک ایسی دینی اصطلاح ہے، جسکے ہمہ گیر مفہوم میں "عالمِ امر" بھی ہے اور ایک بزرگ ترین روح بھی، یہ قانونِ قدرت کے ہر بڑے واقعاتی قصّے کا عنوان بھی ہے اور اس کے اتمام و تکمیل کا انتہائی کامیاب خاتمہ بھی، اس میں عقلِ اوّل کا ابداعی مایہ بھی ہے اور مخلوقات کی اجتماعی زندگی کا خلاصہ بھی، یہ کائنات کی نورانی صُورتِ مجرّد بھی ہے اور اجزائی عالم کا جسمِ متّحد بھی، یہ خدائے واحد کا "امرِ واحد" بھی ہے اور وحدت الوجود کا عظیم ترین کائناتی عمل بھی، غرضیکہ لفظ "امر" کے معنی و مفہوم میں سب کچھ ہے، یہی وجہ ہے کہ حکمائے دین نے "امرِ کُل" کی تعبیر خدا کی خاص بادشاہت سے کی ہیں، پس اسم "اولوالامر" ان کلیّات کے معنوں سے ہرگز خالی نہیں، کیونکہ ان تمام معنوی وجوہ کی بنا پر خود خدائے برتر نے انہیں "اولوالامر" کے اسم سے موسوم فرمایا ہے، تاکہ اس حقیقی اسم اور اس دائمی صفت سے مسمّا و موصوف کی پہچان ہو سکے اور پھر یقین کے ساتھ ان کی اطاعت کی جا سکے۔

تحقیقاتِ معجزات

لفظ "معجزہ" عجز یعنی ناتوانی سے بنا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں وہ کام جس کے کرنے سے کوئی انسان عاجز رہ جائے، بالفاظِ دیگر عاجز کرنے والا کام، مگر دینی اصطلاح میں معجزہ سے وہ کام مراد ہے جو کسی کامل انسان نے کر دکھایا ہو اور دوسرے تمام انسان اس قسم کے کام کرنے سے عاجز رہتے ہوں جس کا مقصد یہ ہو کہ اس انسانِ کامل یعنی نبی کی نبوّت کے متعلق لوگوں کو یہ یقین آجائے کہ یہ نبی خدا کے حکم سے آیا ہے اور اس کی ہدایت و نصیحت پر عمل کرنا ضروری ہے۔

ہم اس مضمون میں خدائے برتر کی توفیق اور اسکے نور کی یاری سے معجزات کی اقسام، ان کے مواقع اور وجوہ کے متعلق کچھ تفصیل لکھتے ہیں تاکہ قارئینِ کرام معجزات کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپکو ایک ایسے معجزے کی جلوہ نمائی دیکھنے کیلئے تیار کریں جس میں دین و دنیا کے لاانتہا فوائد مضمر ہیں، چنانچہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ معجزات کئی قسم کے ہوتے ہیں، اگر انکو بلحاظِ زمان تقسیم کیا جائے تو ہنگامی معجزات اور دائمی معجزات کے نام سے موسوم کئے جاسکتے ہیں، اگر با اعتبارِ مکان ان کو تقسیم کیا جائے، تو حسّی اور عقلی معجزات کہلاتے ہیں اور اگر زمان و مکان دونوں کی ترکیب سے ان کو تقسیم کیا جائے، تو ہنگامی حسّی معجزہ، ہنگامی عقلی معجزہ، دائمی حسّی معجزہ اور دائمی عقلی معجزہ کہلاتے ہیں، پس معجزات

کی اصلی اور بڑی تقسیم یہی ہے یعنی کُلّ چار قسم کے معجزے ہیں جن کی بہت سی شاخیں ہیں، اگر دینی مراتب کی رو سے معجزات کے نام معلوم کرنا مقصود ہو، تو نبی کے مافوق الفطرت کام کا نام معجزہ اور ولی کے ایسے کام کا نام کرامت ہے، اس کیساتھ ساتھ یہاں یہ کہنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، کہ اگر امکانیت کے لحاظ سے ان عجائبات کو تقسیم کیا جائے تو یہ حق و باطل کے دو ناموں میں بٹ جاتے ہیں یعنی معجزہ کے جملہ اقسام حق کہلاتے ہیں اور سحر و جادو کی ساری شاخیں باطل قرار دی جاتی ہیں، مگر اس کے باوجود بسا اوقات عوام النّاس سے ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ معجزہ کو جادو سمجھ کر گمراہ ہو گئے ہیں۔

ہنگامی حسّی معجزہ

وہ امر اعجوبہ ہے جو قادرِ مطلق اپنے کسی نبی کو اسوقت عطا کرتا ہے جبکہ منکرین نے اس نبی سے بشرطِ ایمان آوری کوئی معجزہ طلب کر لیا ہو، چونکہ اکثر منکرین اور خلقِ عامّہ علمِ حقیقت کی تربیت سے محروم اور دلائلِ عقلی سے ناآشنا ہوتے ہیں اور ان کے ادراک کا سارا دارومدار محض حواس پر ہوتا ہے، اس لئے ان کو قائل کرانے کیلئے ایسے معجزے کے وقوع میں آنے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، لیکن بسا اوقات ان معجزات کے باوجود اکثر لوگ اپنی نامعقول اور کورانہ تقلید سے باز نہیں آتے اور صرف چند گنے چُنے خوش نصیب انسانوں کے سوا باقی سب ان معجزات کو سحر و جادو قرار دے کر ان سے قطعی انکار کرتے ہیں، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السّلام کا تمسخر اڑاتے اور انہیں مختلف اذیتیں دیتے ہیں اور نتیجہ اِسکا یہ نکلتا ہے، کہ وہ خداوندی قہر کی زد میں آتے ہیں اور ہلاکت انہیں آگھیرتی ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کی دعوت اور ان کے معجزات سے انکار کر کے ان پر ظلم وستم کرنے والوں پر حکمِ خداوندی سے ہلاکت کے آنے کی کئی ایک وجوہ ہیں،

جن میں سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ بذاتِ خود راہِ راست پر نہیں آئے، پھر جب پروردگارِ عالم نے اپنی رحمت سے ان کیلئے ایک ہادی بھیجا تاکہ انہیں راہِ حق پر لائے تو انہوں نے پھر نہیں مانا اور بشرطِ ایمان آوری معجزہ طلب کیا، جب انہیں معجزہ دکھایا گیا تب بھی انہوں نے ایمان نہیں لایا بلکہ معجزے سے انکار کے علاوہ انبیاءؑ اور ان کے پیروؤں کو ہر قسم کی اذیتیں دینے پر اتر آئے اس طرح جب ان کے راہِ راست پر آنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی، تو قہرِ خداوندی ان پر ٹوٹ پڑا اور وہ اپنے کفر و انکار کی پاداش میں صفحۂ روزگار سے مٹ گئے۔

پس یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء حضرت محمّد مصطفٰےؐ صلعم نے دینِ اسلام کی تبلیغ کیلئے ایسے معجزات سے کام نہیں لیا، جو وقتی اور حسّی ہوں اور نہ ایسے فیصلہ کن معجزات سے کہ اگر کسی انسان نے خوف کے مارے ایمان لایا تو اسکی جان بچ گئی نہیں تو اُسے تباہ کر دیا گیا۔ آنحضرتؐ نے خداوندی حکم سے دعوتِ دین کا یہ راستہ اختیار نہیں کیا اِس لئے کہ آپ رحمت للعالمین تھے، نہیں تو رسولِ اکرمؐ سے بھی مخالفین نے انبیاء ماسلف کے مخالفین کی طرح فیصلہ کن معجزات کا مطالبہ کیا تھا، جیسا کہ قرآنِ پاک میں آیا ہے، قولہٗ تعالیٰ: "وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا - اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا - اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا - اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا" (۱۷: ۹۰-۹۳) "اور (مخالفین نے) کہا ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے، جب تک تو ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ نکالے یا تیرے لئے کھجور اور انگور کا ایک باغ ہو جائے پھر تو اسکے بیچ نہریں چلا کر بہالے یا ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دے

جیسا کہ تیرا کہنا ہے، یا تیرے لئے ایک سنہری گھر ہو جائے یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے جب تک تو ہم پر ایک کتاب نہ اتار لائے جو ہم پڑھ لیں، تو کہہ سبحان اللہ! میں کون ہوں مگر ایک بھیجا ہوا آدمی ہوں۔"

آیۂ مذکورہ بالا سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ منکرین پیغمبرِ آخر زمانؐ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہتے تھے، مگر خدا اور رسول کو ان کا یہ مطالبہ اس لئے منظور نہ تھا کہ منکرین ان معجزات کے نتائج پر ایمان لانے والے نہ تھے جیسا کہ مذکورہ آیت سے ان کے منکرانہ خیالات کی ترجمانی ظاہر ہوتی ہے کہ انکے خیالات کے مطابق چھ عظیم معجزات کر دکھانے کے باوجود بھی وہ یقین نہیں کرتے، جب تک انفرادی طور پر ایک ایک کتاب اتار نہ دی جاتی، جو ان کے کہنے کے مطابق ساتواں معجزہ تھا، تاکہ وہ کتاب کو بہ غور پڑھ کر اپنی عقل سے کوئی فیصلہ کرتے کہ "کیا! جس محمدؐ نے آسمان سے یہ کتاب لاکر انہیں دے رکھی ہے، وہ خدائے واحد کا سچا نبی ہے یا نہیں؟" انکار کی حد دیکھ لیجئے کہ حقیقت سے کس قدر دُور ہے، اِن کے اُن فطری ہم خیالوں کی عادت میں بھی یہی جاہلانہ انکار انتہائی حد تک مضبوط ہو چکا تھا جو اِن سے آگے گزرے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی ہنگامی ضرورت کے مطابق حسّی معجزات کا ایک ایک نمونہ دنیا والوں کو دکھانے کے بعد حضرت محمدؐ کے دَورِ نبوّت میں خدائے حکیم نے تا قیامت ان کو روکے رکھا، یہی حقیقت کلامِ پاک میں ہے کہ: "وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا ؕ وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا" (۵۹:۱۷)۔ "اور ہم کو نشانیاں (معجزات) بھیجنے سے صرف اس (خیال) نے باز رکھا ہے، کہ اگلوں نے اسے جھٹلایا تھا، اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی تھی (انکی) آنکھیں کھولنے کو، مگر انہوں نے اس پر ظلم کیا اور نشانیاں (معجزات) تو ہم صرف خوف دلانے کے لئے بھیجا

کرتے ہیں۔"

اس تفصیل کے بعد ان نکات کا بیان کیا جاتا ہے۔ جو ہنگامی حسّی معجزہ کے باب میں ضروری ہیں اور وہ یہ ہیں کہ حسّی معجزہ کے جملہ اقسام کی واقعیت حواسِ خمسہ پر ہوتی ہے، یعنی ظاہری غیر معمولی عجائبات کا ادراک انسان اپنی آنکھ، کان، ناک، منہ (دہن) اور جلد کے ذریعے کرتا ہے، پس ہم ان معجزات کو ان حواس کی نسبت سے بصری، سمعی، شامّی، ذوقی اور لمسی معجزات کہہ سکتے ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک حسّ پر تین قسم کے معجزات گزرتے ہیں جن کو تنزیلی، تمثیلی اور تسخیری معجزات کہیں گے، لہٰذا حسّی معجزہ کی کُلّ پندرہ قسمیں ہوتی ہیں۔ اِن شاءاللہ ہم ان جملہ اقسام کے متعلق ان حقائق و معارف کو بیان کریں گے جن سے ہر خوش نصیب علم جُو اور صاحبِ ذوق انسان عقلی طور پر مطمئن ہو سکے گا، اور اگر کوئی ذی حکمت انسان کسی تجرباتی معیار پر ان کو پرکھنا چاہے، تو ان کی قدر و منزلت بلند سے بلند تر نظر آئے گی، پھر وہ یقین کر سکے گا کہ علم و حکمت کے ایسے بیش بہا نایاب جواہر صرف امامِ حیّ و حاضر کے روحانی خزانے کے سوا پیدا ہو نہیں سکتے۔

اب ہم جملہ حسّی معجزات کے اقسام کی ایک ایک مثال بشکلِ گوشوارہ پیش کرتے ہیں، تاکہ قارئینِ کرام کو اس موضوع کی حقیقت بآسانی ظاہر ہو سکے۔ [دیکھئے صفحہ ۴۲-۴۵]

ہنگامی عقلی معجزہ

نبی و ولی کا وہ علمِ لدُنّی یا حکمتِ بالغہ ہے، جو خدائے حکیم ان کو عطا کرتا ہے، جس کو عالمی دَور کی نسبت سے ہنگامی معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ اس حکمتِ بالغہ کی غرض لوگوں کو عقلی طور پر یہ یقین دلانا ہے کہ وہ نبی یا ولی خدا کی طرف سے انکی رہنمائی کیلئے آیا ہے تاکہ وہ ان کی ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکیں، اگرچہ لفظ حکمت ظاہری طور پر کوئی معجزاتی اصطلاح تو نہیں اور

نہ اب تک عوام کو اس حقیقت کا کوئی انکشاف ہو چکا ہے کہ انسانِ کامل کے بعض معجزات ایسے بھی ہیں جن کا تعلق علم و عقل سے ہے، لیکن عقلِ سلیم کیلئے یہ ایک قابلِ تسلیم حقیقت ہے کہ جیسے ہمارے حواسِ ظاہری پر انسانِ کامل کے غیر معمولی حسّی عجائبات اثر انداز ہوتے ہیں ویسے ہی ہمارے مُدرکاتِ باطنی پر اس کے عقلی معجزات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بنا بریں یہ ماننا حقیقت پسندی کا ثبوت ہے کہ نبی یا ولی خدا کی دی ہوئی روحانی طاقت کے ذریعے نہ صرف حسّی معجزات کر دکھا سکتے ہیں، بلکہ اسکے ساتھ ساتھ عقلی معجزات بھی عقولِ انسانی کے سامنے لا سکتے ہیں، خواہ ایسے معجزات سے کوئی ہدایت پائے یا اس سے چشم پوشی کرے، جس طرح حسّی معجزہ کلّی حیثیت سے مخالفین کو راہِ حق پر گامزن ہونے کے لئے مجبور نہیں کرتا بلکہ اسکے اثرات سے ان کے دلوں میں یقین کے ساتھ ساتھ مزید شکوک بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اندریں صورت ان کے اختیار کا توازن بحال رہتا ہے اور یہ حسّی معجزہ ان کے لئے ہدایت کی جہت سے صرف ایک معمولی آگاہی کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح عقلی معجزہ بھی عوام النّاس کو ہر حالت میں بجبر و اکراہ صراط المستقیم پر نہیں چلاتا، بلکہ اس میں ان کو حسّی معجزہ سے کہیں زیادہ شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، جن کی ایک نمایاں وجہ عقلی معجزہ میں ظاہری خوف کا نہ ہونا ہے، اسلئے کہ یہ معجزہ انبیاء علیہم السّلام کے قاہرانہ حسّی معجزات میں سے نہیں۔

اب حکمتِ بالغہ کی معجزاتی واقعیت کو قرآنی روشنی میں بھی واضح کر دکھائی جاتی ہے۔ جیسا کہ علیم و حکیم کا یہ ارشاد ہے کہ: "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ" (۵۴:۱-۶)۔ "قیامت نزدیک آ پہنچی اور چاند (روحانی طور پر)

شق ہو گیا، اور یہ لوگ اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو ابھی ختم ہوا جاتا ہے، ان لوگوں نے جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر امر کی قرارگاہ ہے اور ان لوگوں کے پاس (گزشتہ امتوں) کی خبریں اتنی پہنچ چکی ہیں کہ ان میں (کافی) عبرت ہو، حکمتِ بالغہ یعنی اعلیٰ درجے کی دانشمندی حاصل ہو سکتی ہے، سو ان کی حقیقت یہ ہے کہ خوف دلانے والی چیزیں ان کو کچھ فائدہ ہی نہیں دیتیں، تو آپ ان کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجئے۔"

آیۂ مذکورہ بالا کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ نبیٔ آخر الزمانؐ سے جو حسّی معجزات طلب کئے تھے وہ قیامت کی مختلف اشکال میں واقع ہوں گے، اسلئے کہ پیغمبرانِ گذشتہ اور آنحضرتؐ میں ایک نمایان امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ بمرتبۂ خاتم الانبیاء دَورِ قیامت کے پیغمبر ہیں، لہٰذا آپ کے پورے دَور کے اولیاء کے عقلی معجزات اور عالمی ہنگامۂ عظیم کے آخری معجزات سب کے سب آپ ہی کے ہیں، نیز اس آیت کا ایک واضح مطلب یہ بھی ہے کہ ظاہری طور پر جن حسّی معجزات کے دکھانے کی ضرورت تھی، وہ عالمی دَور کے پیشِ نظر مناسب اوقات میں دکھائے جا چکے ہیں، ان کی خبریں متاخرّین تک پہنچائی جا چکی ہیں اور ان معجزاتی خبروں کی تاویل مِن حَیثِ المَجمُوع حکمتِ بالغہ میں موجود پائی جا سکتی ہے، اسی حکمتِ بالغہ کا دوسرا نام خیرِ کثیر ہے، چنانچہ کلامِ پاک میں ہے کہ: "یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۲۶۹:۲)۔" اللہ جس کو چاہے حکمت دے دیتا ہے، اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو حکمت مل جائے، اس کو خیرِ کثیر مل گئی، اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔" پس اگر ان مذکورہ بالا دونوں آیتوں پر عقل و دانش سے غور کیا جائے تو یہ نکتۂ جامع حاصل آتا ہے کہ جس طرح حسّی عجائبات کی چوٹی پر معجزہ کا مقام ہے، بالکل اسی طرح عقلی غرائبات کی

چوٹی پر حکمت کا مقام ہے، پھر اسی حسّی و عقلی بلندی کی سنگھم پر یہ دونوں امور ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں جس طرح انسانی جسم و روح وابستہ ہوا کرتے ہیں، یعنی حکمت کے ظاہری عمل کا نام معجزہ ہے اور معجزہ کے باطنی علم کا نام حکمت اور وہ نام جسمیں لفظ معجزہ اور حکمت دونوں کے کلّی اور حقیقی مفہومات پائے جاسکیں آیت کہلاتا ہے جسکی جمع آیات ہے، چنانچہ قرآنِ شریف کا ارشاد ہے کہ: "وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَ ظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا" (۱۷:۱۰۱)۔ "اور ہم نے موسیٰ کو کھلے ہوئے نو معجزے دئے، آپ بنی اسرائیل سے پوچھ دیکھئے، تو فرعون نے اس کو کہا کہ اے موسیٰ میرے خیال میں تو ضرور تجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔" قرآن کے اس ارشاد سے حقیقت صاف عیاں ہے کہ جن چیزوں کو اصطلاحِ عام میں معجزات کہتے ہیں ان کو اصطلاحِ خاص میں آیات کہا گیا ہے یعنی موسیٰ علیہ السّلام نے جو عجائبات فرعون اور اسکی قوم کو تخویف کیلئے کر دکھائے تھے ان میں یہ چیزیں تھیں عصا، قحط، دریا، ٹڈی، ید بیضا، جوئیں، خون، مینڈک اور طوفان، پس ان حسّی آزمائشی چیزوں کو آیات یعنی معجزات نہ صرف اسلئے کہا گیا ہے کہ یہ غیر معمولی طور پر ظاہر ہوئی تھیں بلکہ اسلئے بھی کہ ان کے ظاہر ہونے میں تاویل یعنی حکمت تھی اور وہ حکمت اب بھی باقی ہے، چنانچہ قرآنِ شریف کے کلمات کے مجموعے کو بھی آیت یا معجزہ کہنا حقیقت ہے، مگر صرف اس لئے نہیں کہ وہ حروف و کلمات کا ایک مجموعہ ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ وہ خدا کا کلام ہے اور اسمیں حکمت ہے، پس ہنگامی عقلی معجزہ یعنی حکمت کے اثبات کیلئے یہی دلائل کافی ہیں۔

دائمی حسّی معجزہ وہ امر اعجوبہ ہے جو کسی پیغمبر کی حیاتِ طیّبہ کے بعد بھی اپنی اصلی شان و جلالت کیساتھ انسانی حواس کے سامنے ہمیشہ

موجود و حاضر پایا جاسکے، اوراس کی خصوصیات میں ذرّہ بھر بھی کمی واقع نہ ہونے پائے۔

چنانچہ سردارِ رُسل کے دو عظیم دائمی حسّی و عقلی معجزات کے سوا جملہ انبیاء کے معجزات ان کی جسمانی حیاتِ طیبہ کے ساتھ ساتھ ختم ہو چکے ہیں، اب ان کی روایات کے سوا عوام النّاس کو کوئی نشان نہیں مل سکتا، پس از روئے قانونِ عقل ان کو ہنگامی معجزات کہنا بالکل درست ہے، اس قسم کے معجزات کی واقعیت کے بارے میں اگرچہ ہر دیندار اعتقادی قوت سے اپنے آپ کو مجبور کرتے ہوئے سطحی طور پر یہ کہتا ہو کہ "قادرِ مطلق جو چاہے کرسکتا ہے اور امرِ ابداعی (یعنی موجودہ طریقۂ پیدائش کے برعکس کسی چیز کا پیدا کرنا) اس کیلئے کوئی مشکل کام ہرگز نہیں" تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ان روایات سے متعلق بہت سے پیچیدہ سوالات بھی رکھتا ہوگا اور اس کے تحقیقاتی جذبے کا ہمیشہ یہ تقاضا رہے گا کہ معلوم کرلیا جائے کہ حضرت صالح نبیؑ کی اونٹنی پتھر سے کس طرح پیدا ہوئی؟ حضرت داوٗدؑ لوہے کو گرم کئے بغیر کس طرح بکتر بناتا تھا؟ کیا یہ حقیقت ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی اژدہا بن جاتی تھی؟ جناب مسیح عیسیٰؑ کن مُردوں کو زندہ کرتا تھا؟ جبکہ مُردے دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی ایک زندہ نما مُردہ دوسرا مُردہ نما زندہ، کیا یہ اور اس قسم کی دوسری تمام روایات حقیقی واقعات ہیں یا تاویلی تمثیلات؟ اب ہم زیرِ نظر بیان کے سلسلے میں اس مبحث پر آگئے، جسمیں ہمیں اس ممکن سوال کا مدلّل جواب دینا ہوگا کہ "حضرت محمّد صلعم کے دو دائمی حسّی معجزے کون کونسے ہیں؟" اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جناب سیّد الثّقلین کے دو دائمی حسّی معجزے قرآن پاک اور امامِ حیّ و حاضر ہیں، جو خدا کی کتاب اور اسکے نُور کی حیثیت سے ایک دوسرے کیساتھ ہر دَور میں پائے جاتے ہیں اور ان کو حقیقت میں ایک دوسرے سے جُدا نہیں

کیا جا سکتا اور ان دونوں کی باہمی وابستگی بھی ظاہراً و باطناً معجزانہ قسم کی ہے یعنی جب ہم کسی آیت، حدیث یا عقلی دلیل سے یہ ثابت کرنے لگیں کہ قرآن بجائے خود ایک معجزہ ہے تو ساتھ ساتھ اور خود بخود امامِ زمان کے دائمی ظہور اور اس کی قرآن سے وابستگی کی دلیل بھی چشمِ بصیرت کے سامنے آنے لگے گی اور اگر اسکے برعکس صرف امام کے ذکر سے شروع کیا جائے تو اسمیں بھی یہی ہوگا کہ ایک کتاب یعنی قرآن ظاہر یا باطن میں ہمارے سامنے آئے گا۔

اب ہم اس ذاتِ یگانہ کی درگاہِ رحمت سے قوتِ بیان طلب کرتے ہیں جس نے اسلام میں کسی چیز کی کمی، کوئی علمی رکاوٹ اور کوئی عقدۂ ناکشا نہیں رکھا ہے، جیسا کہ قرآنِ شریف میں آیا ہے کہ: "هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" (۲۲:۷۸) یعنی "اس نے تم کو (اور امتوں سے) ممتاز فرمایا اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی"۔ اب متعلّقہ جواب کی تفصیل یوں ہے کہ قرآنِ پاک نہ صرف باطنی طور پر بلکہ علومِ ظاہری کے اوصاف و کمالات کی جامعیت کے لحاظ سے بھی اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا، چنانچہ آیۂ درجِ ذیل میں نہ صرف قرآنِ پاک کو علم و حکمت کی بے نظیر کتاب مانا گیا ہے بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اسمیں قرآن کو "معجزۂ محمّدی" تسلیم کرنے کی دلیل بھی موجود ہے آیۂ کریمہ یہ ہے کہ:

"قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا" (۱۷:۸۸)۔ "آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنّات اس بات کیلئے جمع ہو جائیں، کہ ایسا قرآن بنا لائیں تب بھی ایسا نہ لا سکیں گے، اور اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں"۔ اب یہاں ایک بہت اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدائے برتر کے فرمان پر ہمارا ایمان تو ضرور ہے اور وہ جس کام کا کرنا ناممکن قرار دے تو بلاشبہ وہ ناممکن ہی ہوتا ہے، لیکن کیا ہم یہ بھی معلوم

کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کہ وہ کونسی وجہ ہے جس سے تمام انسان اور جنّات باہم یار و مدد گار ہونے کے باوجود بھی قرآن کی مانند کوئی کتاب بنا نہیں سکتے، اور کیوں ان کی متّحدہ علمی قدرت اس فعل کے سامنے آکر عجز و ناتوانی کی ایک خاموش صورت بن جاتی ہے؟

پس اس کا واحد جواب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم سر تا سر حکمت ہے یعنی جس جامع المعانی اصول پر قرآن کی حقیقت الفاظ و کلمات میں سمو دی گئی ہے اور جس اندازِ بیان سے دُور رس مثالیں اسمیں بیان کی گئی ہیں، وہ اصول اور وہ انداز انس و جنّ کے کسی فرد کو معلوم نہیں، جسکی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص باوجود آنکہ قرآنِ پاک اسکے حواسِ ظاہری کے سامنے موجود ہے اس کا معنوی تجزیہ نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر یہ امر ممکن ہوتا کہ انسان اپنی عقلِ جزوی سے قرآن پاک کا معنوی تجزیہ کر سکے یعنی اس کے حروف، کلمات اور آیات کے معنی کچھ اسطرح کھولے اور ان میں چشمِ بصیرت سے دیکھے جسطرح کوئی کاریگر کسی مشین کو کھول کھول کر دقّت سے معائنہ کرتا ہو، اندرین صورت انس یا جنّ کے ایسے شخص کو پتہ لگ سکتا کہ یہ آسمانی کتاب کن کن معنوی اصولوں پر مبنی ہے، پھر یہ علم عام ہو جاتا اور سب اس پر قادر ہوتے جاتے۔ اور انس و جنّ کوئی ایسی کتاب لکھ سکتے، کیونکہ کسی کاریگر کو جب کسی چیز کے ظاہر و باطن کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے، تو وہ اسکی مانند ایک جُدا چیز بنا سکتا ہے۔ مذکورہ بیان سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت پر آگئی کہ انس و جنّ نہ صرف قرآن جیسی کتاب بنانے سے قاصر ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس آسمانی کتاب کی حکمت سمجھنے سے بھی عاجز ہیں، پھر جس مقدس کتاب کو حواس کے سامنے موجود پاتے ہوئے بھی انسان و جنّات اس کے سمجھنے اور بنانے سے عاجز ہو جاتے ہوں، اس کو ایک عظیم حسّی معجزہ کیوں نہ مانا جائے۔

اب ہمیں مذکورہ بالا آیت ہی سے یہ حقیقت ظاہر کر کے دکھانا ہے کہ امامِ زمان کو کن دلائل سے "معجزۂ محمدی" مان لیا جا سکتا ہے اور اسی آیت میں قرآنِ پاک اور امامِ حاضر کی کونسی وابستگی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان کی ظاہری و باطنی ہدایت کے لئے قرآنِ پاک کا نازل کئے جانا، پھر انسانی عقل کی رسائی سے قرآنی حقائق کا برتر واقع ہونا اس امر کی ایک مستحکم دلیل ہے، کہ اس ظاہری دنیا میں قرآنِ پاک کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ایک ایسے معلمُ القرآن کا ہونا ضروری ہے جس کو بباطن خدائے برتر نے اپنے نور کی حیثیت سے بھیجا ہو اور بظاہر آنحضرتؐ نے اپنا جانشین مقرر کیا ہو، تاکہ قرآنی مشکلات اور حالاتِ حاضرہ کے مطابق ہدایت کے بارے میں خدائے حکیم پر لوگوں کی کوئی حجّت نہ ہو سکے۔

پس امرِ واقع یہ ہے کہ نورُ القرآن بہ لباسِ جسمِ انسان ہمیشہ دُنیا میں حاضر و ناظر موجود ہے جس کو امامِ زمان یا انسانِ کامل کہا جاتا ہے پھر اگر اس نور کو اس لئے پہچانا نہیں جاتا کہ بتقاضائے حکمت اسکا ظاہری تعلق بشری جسم اور اسکے لوازمات سے ہے، تو اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی جیسا کہ کوئی ناسمجھ انسان قرآنِ پاک کو خدا کا کلام محض اس لئے نہیں مانتا ہو، کہ وہ کاغذ، سیاہی، حروف اور الفاظ جیسے مادّی چیزوں کا بنا ہوَا ہے، اور یہ بات کبھی اس کے گمان و خیال سے بھی نہ گزری ہو کہ یہ آسمانی کتاب ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ان مادّی چیزوں کے پسِ پردہ علمِ الٰہی کا ایک کمیاب خزانہ موجود ہو، پھر ان حالات کے پیشِ نظر آیۂ مذکورہ کا خدائی اعلان نہ صرف قرآنِ پاک کی بے مثالی کے بیان تک محدود ہے بلکہ اس میں امامِ زمان کی بے نظیری کا بیان بھی مضمر ہے اسلئے کہ قرآن اور امام حقیقت میں ایک ہی نور ہے، لہٰذا اس اعلانِ حق میں تمام انسان اور جنّات کو یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ اگر امامِ حق کے مِن عندِ اللہ ہونے پر تمہیں یقین نہیں اور مرتبۂ امامت کو محض انفرادی یا اجتماعی

جدوجہد کا ایک عام نتیجہ سمجھتے ہو، تو تم بھی آپس کے اتفاق واتحاد سے ایک ایسے کامل انسان کا انتخاب کرو جو اپنے ظاہری وباطنی اوصاف سے حقیقی امام کا ہم صفت ہو سکے اور اس کی اپنی ہی ذریّت میں اس کا منصبی سلسلہ تا قیامت اسی طرح باقی رہ سکے، جسطرح حقیقی امام کے یہ اوصاف انسانی حواس کے سامنے موجود پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ سارے انسان اور جنّات کیلئے امامِ زمان کا ایک ایسا نظیر قائم کرنا ناممکن رہا ہے اور ناممکن رہے گا، پس ہمارا یہ کہنا ایک روشن حقیقت ہے کہ امامِ زمان کی ظاہری دائمی موجودیت حضرت محمّد صلعم کا دوسرا دائمی حسّی معجزہ ہے۔

دائمی عقلی معجزے

دائمی عقلی معجزے کے بیان سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اس میں وہ تمام معجزاتی خصوصیات بھی شامل ہیں جن کا ذکر ہنگامی عقلی معجزے کے بارے میں ہو چکا ہے۔ اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آنحضرتؐ کے دو دائمی عقلی معجزے بھی قرآن اور امام ہی ہیں، اس سے قبل ان کو دو دائمی حسّی معجزوں کی حیثیت سے ثابت کیا گیا ہے اب یہاں پر یہ واضح کرنا ہے کہ قرآن اور امام دو دائمی عقلی معجزے بھی کسطرح ہو سکتے ہیں، اسکی دلیل یہ ہے کہ خدائے برتر کی جانب سے حکمتِ بالغہ کے نام سے جو خیرِ کثیر جنابِ محمّدؐ کو دی گئی تھی وہ حکمتِ قرآن اور معلمُ القرآن کی حیثیت سے اب بھی موجود ہے، یہ دونوں عقلی معجزات ساری مخلوق کی مادّی اور روحانی لاانتہا عروج کی وسیع ہدایت اور حکمت سے اس قدر مملو اور بھاری ہیں، کہ سارے انسان اور جنّات اپنی متّحدہ عقلی طاقت کے باوجود بھی ان کو بیک وقت اٹھانے سے عاجز ہیں، یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ نے ان دونوں معجزات کا نام "ثقلین" یعنی بھاری چیزیں رکھا اور اپنی امّت سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں اب تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ

جاننے والا ہوں۔

یہ بات قبلاً احاطۂ تحریر میں آچکی ہے کہ معجزہ دکھانے کی اصلی غرض یہی ہے کہ لوگ صاحبِ معجزہ کو خدا کا نبی یا ولی مانیں اور اس پر یقین کریں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ معجزہ درحقیقت کسی کی نبوّت یا ولایت کے اثبات کے لئے ایک عملی گواہ کی حیثیت رکھتا ہے پس ہم معجزہ کے اس پہلو سے بھی یہ حقیقت ظاہر کرکے دکھاتے ہیں کہ سیّدِ کونین کے یہی دو دائمی عقلی معجزات یعنی قرآن اور نورُ القرآن آنحضرتؐ کی نبوّت کے ایسے دو گواہ ہیں جو حسّی اور عقلی وجود میں ہمیشہ موجود ہیں، جو شہادت کی جملہ شرائط میں موجودات سے بڑھ کر ہیں، جن کی تردید حقیقت میں ہو نہیں سکتی، نہ ان گواہوں کو مٹایا بجھایا جاسکتا ہے، چنانچہ خداوند فرماتا ہے کہ: "وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ" (۱۳: ۴۳)۔ یعنی "اور یہ کافر لوگ یوں کہہ رہے ہیں کہ آپ پیغمبر نہیں، آپ فرما دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان (میری نبوّت پر) اللہ اور وہ شخص جسکے پاس کتابِ (آسمانی) کا علم ہے گواہ کافی ہیں"۔ یعنی بباطن خدا اور نورِ امامت اور بظاہر قرآن اور شخصِ امامت ایسے واقفِ کُلّ (کافی) گواہ ہیں کہ اِن کی ذات میں حضرت محمدؐ کی نبوّت کے اسرار کا پورا پورا علم موجود ہے اور لوگ ان سے اس بارے میں جس قسم کی بھی شہادت پوچھیں تو وہ ان کو ہر وقت بلاکم و کاست بتا سکتے ہیں۔

اب اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ کس دلیل کی بنا پر یہ کہا اور مانا جاسکتا ہے کہ نورِ امامت علومُ القرآن کا یکتا معلّم، اسرارِ نبوّت کا واقفِ کُلّ اور نبوّتِ محمدّی کا گواہِ مطلق ہے؟ تو اسکے جواب میں دلیلِ اوّل یہ ہے کہ خدا کے کلام میں سچائی اور عدل بدرجۂ اَتم موجود ہے، "وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا" (۶: ۱۱۵) اسلئے یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ نبوّتِ محمدّی کی شہادت کیلئے لوگوں میں سے ایک

شخص کا انتخاب کرے اور اسے گواہِ کافی (پورا) کے خطاب سے نوازے، جو ماضی، حال اور مستقبل میں یکساں طور پر نبوّتِ محمدؐی کی گواہی نہ دے سکتا ہو جو بیک وقت حسّی اور عقلی دونوں صورتوں میں اسکا گواہ نہ بن سکتا ہو جسکو بعض اسرارِ نبوّت کا علم ہو اور بعض کا نہ ہو، اور جو قرآنی تاویل کسی حد تک جانے اور ما بقی سے ناواقف ہو، ایسا کبھی ہو نہیں سکتا، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے یہاں گواہِ کافی اور حاملِ علمِ آسمانی قرار دیا ہے، وہ نبوّتِ محمدؐی کی شہادت کے متعلق سب کچھ جانتا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے، پس ایسا گواہ نورِ امامت ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

دلیلِ دُوم: اسی طرح یہی حکمت لفظ شہید (حاضر) میں بھی ہے کہ گواہ کا نام عربی میں شہید ہے جس کے معنی حاضر کے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی معاملے کا گواہ اس صورت میں بن سکتا ہے جب کہ وہ اس معاملے میں حاضر رہ کر اُسے دیکھ چکا ہو، پس ایسا شخص نورِ امامت ہی ہے جس نے خدائی نور کی حیثیت سے سب کچھ دیکھا ہے۔

دلیلِ سوم: جیسا کہ ہم نے دلیلِ اوّل میں ظاہر کیا کہ کلماتِ قرآنی سچائی اور عدل سے بھرپور ہیں، چنانچہ ذیل کی قرآنی مثال پر بھی اسی صدق و عدل کے نظریئے سے غور کیجئے مثال یہ ہے کہ "مَنْ کَانَ عَالِمُ الْقُرْآنِ" (جو کوئی قرآن کا جاننے والا ہے) اور "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ" (۱۳: ۴۳)۔ (جسکے پاس کتاب کا علم ہے) دونوں کلمات کے معنوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مقدم الذّکر کلمے کا مطلب ایک ایسے شخص سے ہے جو قرآنِ پاک کو دیکھے اور اسکے علم کا عالم ہو، لیکن اس کے برعکس مؤخر الذّکر کلمے سے وہ شخص مراد ہے جسکے پاس ہی خود کتاب کا علم ہو، اسکے علاوہ اس کلمے میں یہ حقیقت بھی ہے کہ قرآن کے بجائے کتاب کا لفظ استعمال

کئے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ کتابِ کُل یعنی امّ الکتاب کے معنی میں آیا ہے، کیونکہ جملہ کُتب کی ایک مجموعی کتاب بھی ہے جس کا نام اُمّ الکتاب ہے، پس اُمّ الکتاب بقولِ قرآن، بدلیلِ حدیث اور برہانِ عقلی علیؑ المرتضٰی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ہے جس کا نور امامِ زمان میں ہے اور اسی نور میں علمِ اوّلین و آخرین سمویا ہوا موجود ہے۔

حسّی معجزات کی قرآنی مثالیں

نمبر شمار	مثال	حسّی معجزات کے اقسام		دلیلِ مختصر	قرآنی حوالہ جات
۱	حضرتِ ابراہیمؑ کے گھر مجسم فرشتے آئے۔	بصری	تنزیلی معجزہ	چونکہ فرشتے تھے اسلئے کھانے سے انکار کیا۔	۵۱ : ۲۳-۲۷
۲	حضرتِ مریمؑ نے مجسم روح القدس کی بات سنی۔	سمعی		خیال میں نہیں بلکہ ظاہری طور پر۔	۱۹ : ۱۷-۱۹
۳	قومِ عاد نے عذاب کی بُو سونگھی۔	شامّی		زور کا جھکڑ تھا جس میں بُو بھی تھی۔	۵۴ : ۱۵-۲۰
۴	حواریوں نے غیبی کھانا کھایا۔	ذوقی		آیت میں "آسمانی دسترخوان" کہنا ہی ان چیزوں کے آسمانی ہونے کی دلیل ہے۔	۵ : ۱۱۱-۱۱۵
۵	چند شریروں نے صالحؑ کی اونٹنی کے پیر کاٹ ڈالے۔	لمسی		اگر غیب کی چیز ٹھوس نہ ہوتی تو پھر اونٹنی کے پیر کاٹنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔	۹۱ : ۱۳-۱۴

نمبر شمار	مثال	حسّی معجزات کے اقسام		دلیلِ مختصر	قرآنی حوالہ جات
٦	نافرمان ماہی گیروں کا بندر بنا دیکھا گیا۔	بصری	تمثیلی معجزہ	مٹی کو آدم کی شکل دینے والے کیلئے انسانوں کو بندر کی شکل میں تبدیل کرنا کوئی مشکل نہیں۔	٦٦-٦٢:٢
٧	حضرتِ عیسیٰؑ نے پیدا ہوتے ہی لوگوں سے کلام کیا۔	سمعی		اگر روح القدس جسم کے بغیر بات کرسکتی ہے تو کسی بچے کی زبان سے کرنا کوئی تعجب نہیں۔	٣٠-٢٨:١٩
٨	یعقوبؑ نے غیر معمولی مسافت سے یوسفؑ کی بُو محسوس کی۔	شامّی		روحانی قوت تمام چیزوں پر حاوی ہونے کی وجہ سے نہ صرف بُو بلکہ ہر چیز کو نزدیک لاسکتی ہے۔	٩٤:١٢
٩	فرعون اور اس کی قوم کیلئے پینے کا پانی خون بن گیا۔	ذوقی		پانی حیوان کے ذریعے خون بنتا ہے تو قدرت کیلئے بلا ذریعہ خون بنانا کوئی مشکل نہیں۔	١٣٣:٧
١٠	قارون زمین میں دھنس گیا۔	لمسی		جس کا اثر جِلد سے شروع ہوا۔	٨١:٢٨

نمبر شمار	مثال	حسّی معجزات کے اقسام		دلیلِ مختصر	قرآنی حوالہ جات
۱۱	سلیمانؑ کی بادشاہت لوگوں نے دیکھی	بصری	تسخیری معجزہ	یہ مسلمہ روایت ہے کہ ہَوا، پرندے اور جنّات اس کے تابع تھے۔	
۱۲	داؤدؑ کی خوش الحانی سمعی معجزہ تھا۔	سمعی		انسان کے علاوہ پہاڑ اور پرندے تک ان کی آواز سے محظوظ ہوتے تھے۔	۷۹:۲۱
۱۳	آنحضرتؐ دائیں طرف سے غیبی خوشبو محسوس کر رہے تھے۔	شامّی		یمن کے معنی یمین کے بھی ہیں۔ (انی لاجد .....)	
۱۴	بنی اسرائیل پر ایک وقت تک من وسلویٰ اترتا تھا۔	ذوقی		جب یہ مسلمہ ہے کہ ہر چیز بہشت سے آئی ہے تو کسی پیغمبر کی دعا پر کوئی کھانے کی چیز کا آنا کوئی تعجب نہیں۔	۵۷:۲
۱۵	بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ ہوتا تھا۔	لمسی		سایہ کا اثر اوّلاً جِلد پر ہوتا ہے۔	۵۷:۲

نوٹ

۱۔ ان اقسام میں سے بعض میں ایک سے زیادہ خصوصیات بھی پائی جاسکتی ہیں، مثلاً مائدۂ عیسیٰ کی چیزوں میں ذوقی خاصیت کے ساتھ ساتھ بصری، شامّی اور لمسی معجزہ کی خصوصیات بھی تھیں، مگر چونکہ کھانے کی چیزیں تھیں اس لئے اسے ذوقی معجزہ میں رکھا۔

۲۔ قرآنِ پاک میں بے شمار معجزاتی واقعات کا ذکر موجود ہے لیکن ہم نے بغرضِ اختصار ہر نوع سے صرف ایک ایک معجزہ کی مختصر مثال یہاں پر درج کی ہے۔

۳۔ تنزیلی سے مراد یہاں پر وہ چیزیں ہیں جو پردۂ غیب سے ظہور پذیر ہوئی ہوں، تمثیلی سے مراد وہ چیزیں ہیں جو معجزانہ طور پر غیر معمولی حالت اختیار کرچکی ہوں اور تسخیری سے مراد کسی چیز کا غیر معمولی طور پر کسی کا تابع فرمان ہونا ہے۔

انسانِ کامل کی جسمانی معرفت

بعض لوگوں کے عقیدے کے مطابق انبیاء و اولیاءؑ کے خاکی اجسام اور ان کے لوازمات ایسے نہیں ہوتے، جیسے دوسرے انسانوں کے ہوتے ہیں، وہ اس سلسلے میں کچھ غیر فطری جسمانی خصوصیات بیان کرتے ہیں، چونکہ یہ موضوع ہمارے اگلے مضمون (تحقیقاتِ معجزات) سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے ہم اس بارے میں ان مفروضہ جسمانی خصوصیات کی تفصیل سے قطع نظر صرف ان حقائق کا ذکر کرتے ہیں، جو ہمیں انبیاء و امامانِ حقؑ کی جسمانی معرفت حاصل کرنے کیلئے ازبس ضروری ہیں۔

نبی اور امامِ حقؑ کی جسمانی معرفت دراصل دین کا ایک ایسا بنیادی اور کلیدی مسئلہ ہے، جسکو اگر کوئی خوش نصیب انسان عقیدت، محبّت اور علم کے ذریعے اچھی طرح سے سمجھ سکے تو وہ امن و سلامتی کے ساتھ راہِ حق پر گامزن ہوسکتا ہے ورنہ نبی و ولی کی معرفت کی ضد انکے سامنے آتی ہے جسے ناشناسی کہتے ہیں، اور وہ بیگانوں کے خلاف ایک ایسا طلسماتی عمل ہے، جس نے ابتدائے دَور سے لیکر اب تک بہت سے لوگوں کو نہ صرف گنجِ حقیقت میں داخل ہونے سے روکا، بلکہ اس نے ان کے وہم و گمان میں اس شدت کا خوف و ہراس ڈالا کہ وہ اس گنجینۂ حقائق کے راستے سے واپس بے تحاشا فرار ہوگئے، اور اب ان

کا اس طرف رُخ کرنا ناممکن ہے۔

اگر آپ ہر دَور کے منکرینِ نبوّت کا تذکرہ قرآنِ پاک میں بغور پڑھ چکے ہیں، تو آپ بلا دقّت یہ حقیقت سمجھ سکتے ہیں کہ مختلف ادوار کے ایسے منکرین سب یک زبان ہوکر انبیاء علیہم السّلام کے خلاف سب سے پہلے یہی اعتراض کر رہے ہیں کہ انبیاء انہی کی طرح انسان ہیں، اور اسکے سوا وہ کچھ بھی نہیں، جس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ انسانِ کامل کا جسم غیر معمولی قسم کا ہونا چاہیئے۔ اب غور و فکر سے ان کے اس اعتراض کی وجہ معلوم کر لینا چاہیئے، کہ یہ لوگ علَی الاتّصال انسانِ کامل کی جسمانیت پر کیوں معترض ہوتے آئے ہیں؟ کیا ان کے پاس کوئی ایسا میزانِ معرفت یا معیارِ شناخت ہے؟ جس کے ذریعے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں، کہ سچّے نبی یا انسانِ کامل کی جسمانی خصوصیات فلاں قسم کی ہونی چاہئیں، یا ان کی فطرت ہی اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ دائرۂ جسمانیت میں محدود رہتے ہوئے صرف انسانِ کامل کی بشریت اور اس کے لوازمات ہی پر بحث کرتے رہیں، آپ کو تفصیلِ ذیل سے اس اعتراض کی وجوہ اور اس مضمون سے متعلق سوالات کے تسلّی بخش جوابات مل سکتے ہیں۔

جسدِ نورانی کے ذکر سے قطعِ نظر انسان کے جسمِ خاکی اور بشریت کے متعلق ضروری تحقیق یہ ہے کہ انبیاء، اولیاء، اتقیاء اور سارے عوام النّاس فطری تعلقاتِ جسمانیت اور قدرتی لوازماتِ بشریت میں عام طور پر برابر کے شریک ہیں، اور کسی بھی انسان کی جسمانیت درحقیقت نہ اس کی اصالت کی کوئی دلیل بن سکتی ہے، اور نہ اس کی رذالت کی کوئی علامت، کیونکہ خدائے برتر اپنی ذات و صفات کی حقیقت میں ایک ہے، اسکا قانون یعنی سنّت اور فطرت (طریقۂ پیدائش) بھی ایک ہی ہے (۳۰:۳۰)، پس اس نے اپنی فطرتِ واحدہ کیمطابق انبیاء، اولیاء

اور عوام النّاس کے اجسام کو امتزاجِ عناصر اور لوازماتِ تولید کے ایک ہی طریقے پر پیدا کیا، پھر ان اجسام کی فطری ضروریات اور انکے نتائج میں بھی کوئی فرق نہیں رکھا۔ نیز اگر انسان کی اس امتحانی تخلیق کے بہت سے طریقے ممکن ہوتے، تو قانونِ قدرت کو وہ طریقۂ پیدائش منظور ہوتا، جسمیں علم و عمل کی زیادہ سے زیادہ امکانیت موجود ہو، پس حقیقتِ حال بھی یہی ہے، کہ فی الواقع انسان کو ایک موزون ترین فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ: "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ" (۴:۹۵) "اور یقیناً ہم نے انسان کو ایک بہترین تعدیل (ترتیب) میں پیدا کیا ہے۔" پس اگر انسانوں کی جسمانی تخلیق ایک بہترین تعدیل میں ہوئی ہے، تو اس تخلیقی بہتری کی واقعیت سب سے پہلے انسانِ کامل پر ہونی چاہئے، کیونکہ جس کامیاب نتیجے کے پیشِ نظر انسانی خلقت کو بہترین قرار دی گئی ہو، وہ سب سے پہلے نبی و ولی کے جسمانی علم و عمل سے برآمد ہو سکتا ہے۔

پس ظاہر ہے کہ پیغمبر اور امام کی یہی جسمانیت اور بشریت اس دنیا میں انسانی آزمائش اور ہدایت کے لئے انتہائی موزون ہے، کیونکہ اگر وہ اپنے جسدِ نورانی (جسمِ مثالی) میں عام لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جاتے تو درین صورت ان کا یہ عمل بحقیقت نہ ذریعۂ آزمائش ہو سکتا ہے اور نہ وسیلۂ ہدایت، اسلئے کہ ذریعۂ آزمائش وہ نہیں، جسکی وجہ سے علم و عمل کے لاتعداد مراتب اور معرفت کے بیشمار درجات کا یکایک خاتمہ ہو جائے، اور ہدایت تو آزمائش کے نتیجے کی صورت میں مل سکتی ہے، پھر جب آزمائش نہ رہی تو اس کے نتیجے کا سوال ہی نہ رہا، اس کے علاوہ ہدایت اس رہنمائی کا نام ہے جو انسان کو معرفت کے درجاتِ عالیہ تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے پھر اگر معرفت کے مختلف درجات نہ ہوں، تو ہدایت اور آگے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، پس ظاہر ہوا کہ معرفت ہدایت کا نتیجہ

ہے، ہدایت آزمائش کی حامل ہے، اور حقیقی آزمائش کا ذریعہ صرف انسانِ کامل کی جسمانیت و بشریت ہی ہے۔

اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کس طرح انسانِ کامل کا جسمِ عنصری امّت کیلئے ذریعۂ آزمائش ثابت ہوسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کیطرف سے انسان کو ہمیشہ دنیاوی معاملات اور دینی امور میں آزمانا منظور ہے اور انسان کی دنیاوی آزمائش کے اسباب دنیاوی قسم کے اور دینی قسم کی آزمائش کے ذرائع دینی قسم کے ہوتے ہیں، اب دین کی ابتداء وانتہا اور مذہب کی جامعیت و مرکزیت انبیاء اور انکے جانشین علیہم السّلام کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا، پس انسان کی دینی و روحانی آزمائش کا سب سے بڑا ذریعہ انسانِ کامل کا جسم اور اس کی بشریت ہے، اور انسان کی دینی آزمائش انسانِ کامل کا فرمان ہے، جو اپنے قول عمل اور اپنے جسم سے متعلق کسی واقعہ کی صورت میں انسان کے سامنے لاتا ہے۔

آپ اس تاریخی واقعہ پر غور کیجئے کہ حضرت محمّد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم باوجود آنکہ تمام انبیاء واولیاء میں سے اشرف تھے، لیکن آنحضرت بھی وہی جسمِ عنصری رکھتے تھے، جو جسم دوسرے تمام انسان رکھتے ہیں، اگر پیغمبرِ اسلام کا وہ جسمِ مبارک معجزاتی قسم کا ہوتا، تو رسولِ خدا دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں سے وہ تکالیف نہ اٹھاتے، جو غزوۂ اُحد میں انکو اٹھانی پڑیں، چنانچہ اس واقعہ کا ایک مختصر مطلب درج ذیل ہے:

جب غزوۂ اُحد میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا دندانِ مبارک شہید ہوا، اور سرِ مبارک زخمی ہوکر بہت سا خون بہہ نکلا، تو آنحضرتؐ ایک غار میں جا گرے اندرین حال کافی دیر تک آنحضرتؐ مسلمانوں کو نظر نہ آئے، پھر مسلمان ان کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، یہاں تک کہ دشمن کی افواہ اور

انکی غیر موجودگی کی بنا پر آنحضرتؐ کو انھوں نے شہید سمجھا، پھر چند خاص بہادروں کے سوا باقیوں کے ظاہر و باطن پر جو حالت گزری، اس کی ترجمانی آیۂ درج ذیل سے ہو رہی ہے جو اسی وقت نازل ہوئی تھی:

"وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ" (۳: ۱۴۴)۔ "اور محمدؐ (جسمانیت میں کچھ اور قسم کا) نہیں، مگر ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، پھر اگر وہ انتقال کر جائے، یا شہید ہو جائے، تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو الٹے پاؤں پھر بھی جائے گا، تو وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا، اور اللہ شکر گزاروں کو جزائے خیر عطا کرے گا"۔

اس مقام پر یہ جاننا ضروری ہے کہ رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ قولاً و عملاً اُمّت کیلئے ایک مکمل ہدایت اور ایک بہترین مثال تھی، اور ان کی عملی زندگی کے اسوۂ حسنہ ہونے میں کسی بھی مسلمان کو شک نہیں، پس ایک مکمل عملی ہدایت اور ایک بہترین نمونۂ زندگی پیش کرنے کیلئے یہ امر ضروری تھا کہ انبیاء اور اماماں علیہم السّلام کے بھی وہی اجسامِ عنصری ہوں جو دوسرے تمام انسانوں کے ہوتے ہیں تاکہ اُمّت کو صحیح معنوں میں عملی ہدایت دی جا سکے، اور اس جسمانی ہم جنسیت کے ذریعے انسان ان تک رسا ہو سکیں، مثال کے طور پر اگر کوئی روحانی فرشتہ لوگوں سے یہ کہہ دیتا کہ اے لوگو! تم بُرے کاموں سے بچو اور نیک کاموں کو انجام دو، تو یہ اس کی نامکمل ہدایت ہو جاتی، کیونکہ اس نے ان کو صرف ایک قولی ہدایت دی اور اس سے انہیں عمل کی امکانی صورت ظاہر نہ ہو سکی، اگر یہی فرشتہ انسانی فطرت پر دنیا میں پیدا ہو جاتا اور جسمانی مصائب و آلام سے گزرتے ہوئے خدا کی طرف سے انسان کی ہدایت کرتا، تو حقیقت میں یہی ہدایت ایک عملی اور مکمل ہدایت

کہلاتی اور انسانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوسکتی، پس پیغمبر اور امامؑ اپنے قول و عمل سے لوگوں کے لئے ایک مکمل ہدایت پیش کرتے ہیں جس سے لوگوں کیلئے عمل کی امکانی صورت ظاہر ہوسکتی ہے، اور یہ امر صرف پیغمبر اور امام کے جسمِ عنصری ہی سے ہوسکتا ہے۔

پیغمبر اور امامِ حقؑ کی جسمانیت و بشریت کے متعلق جتنے بھی سوال پیدا ہوسکتے ہیں، ان سب کے لئے قرآنِ پاک کا یہی ایک مختصر اور جامع جواب کافی ہے، اور ہم نے اس سلسلے میں جو کچھ یہاں تک لکھ چکا اور جو کچھ لکھنے والے ہیں، وہ سب اسی ایک ہی جوابِ کلّیہ کی تشریح میں شامل ہے، اور وہ جوابِ کلّیہ اس آیۂ کریمہ میں موجود ہے کہ:

"قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا" (۱۸: ۱۱۰)۔

"(اے محمدّ) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں، میرے پاس بس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود (برحق) ایک ہی معبود ہے، سو جو شخص اپنے ربّ سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔" پس معلوم ہوا کہ حضرت محمدؐ صرف جسمِ عنصری اور اس کے فطری لوازمات ہی کی نسبت سے اوروں کی طرح بشر تھا، مگر جو وحی خداتعالیٰ کی طرف سے اس پر نازل ہوئی تھی اس کی نسبت سے آنحضرتؐ اُن سے ممتاز و مخصوص تھا پھر جب اشرفِ انبیاء و اولیاء کا بشر ہی ہونا ثابت ہے، تو انکے وصی یعنی امامِ حق کا بھی بشر ہونا لازمی ہے، مگر جس طرح نبی صلعم تنزیلِ وحی میں دوسرے تمام لوگوں سے ممتاز و مخصوص ہے اسی طرح امامِ حق تاویلِ وحی میں دوسرے تمام انسانوں سے ممتاز و مخصوص ہے۔

جشنِ نوروز

نوروز کے معنی نئے دن کے ہیں، لیکن اس سے مراد وہ یومِ جشن ہے، جو سالِ نو کی آمد پر موسمِ بہار کے آغاز ہی میں منایا جاتا ہے جس میں برجِ حمل سورج کے مقابل ہونے لگتا ہے اور جہاں سے مصریوں اور ایرانیوں کے شمسی سال کا نیا دن گنا جاتا ہے۔ جشنِ نوروز دنیا کے قدیم تہواروں میں سے ہے، اور بعض معتبر روایات کے مطابق یہ جشن چند تاریخی واقعات اور دینی فتوحات کا بھی حامل ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ یہی جشنِ نوروز تھا، جسمیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اب سے تقریباً چار ہزار دو سو سال پہلے ملکِ عراق کے شاہی بتوں کو توڑ ڈالا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بھی اپنے زمانے میں اسی روز فرعونِ مصر کے جادوگروں کو شکستِ فاش دے دی تھی، چنانچہ ہم آیۂ درجِ ذیل کی روشنی میں تحقیقات کر کے اس امر کی واقعیت کو دکھاتے ہیں۔

قرآن کے اس ارشاد میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور فرعون کے ساحروں کے مقابلے کا ذکر ہو رہا ہے: "قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى - فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى - قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى" (۲۰ : ۵۷-۵۹) یعنی "فرعون نے کہا اے موسیٰ! تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے

کہ ہم کو اپنے جادو کے بل سے ہمارے ملک سے نکال دے؟ تو ضرور ہے کہ ہم بھی تیرے پاس اس کا مثل جادو لائیں، پس ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدے کا دن ٹھہرا لے، جسکی خلاف ورزی نہ ہم کریں نہ تو، ایک ہموار جگہ میں جمع ہو جائیں، موسیٰؑ نے کہا تمہارے وعدے کا دن آرائش کا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے جمع کئے جائیں۔"

اب اگر قرآنی حکمت کی ہمہ گیر معنویت پر غور کیا جائے تو یقینی بات ہے کہ "یوم الزّینۃ" سے مراد جشنِ نوروز ہے، کیونکہ قرآنِ شریف میں کسی نہ کسی صورت میں ہر چیز کا ذکر موجود ہے، ساتھ ہی جشنِ نوروز مصر میں قدیم سے چلا آرہا تھا، نیز لغوی جہت سے بھی آرائش کا دن آغازِ بہار ہی میں ہونا درست تر ہے اور دن چڑھنے پر اجتماع کی مناسبت کا اشارہ بھی یہی ظاہر کرتا ہے، کہ یہ جشنِ نوروز ہی ہے، کیونکہ آغازِ بہار تک مصر میں سردی رہتی ہے، اسلئے کہا گیا ہے کہ لوگ دن چڑھے جمع ہو جائیں، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السّلام مدین سے واپس آرہے تھے تو دورانِ سفر میں ان کی بیوی صفورا کے لئے سردی کی وجہ سے آگ جلانے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا ذکر (۲۰: ۹-۱۰) میں موجود ہے، حضرت موسیٰ نے مصر پہنچتے ہی فرعون اور اسکی قوم کو پیغامِ الٰہی سنانا شروع کیا اور کچھ دنوں بعد آیۂ مذکورہ کیمطابق نوبت یہ آئی کہ معجزہ اور جادو کا مقابلہ کرایا جائے اور اسوقت موسم کچھ اعتدال پر آیا تھا اور وہ یومِ موعود جس میں مقابلہ کرایا گیا جشنِ نوروز ہی تھا۔

آیتِ مذکورہ بالا سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ جشنِ نوروز کے ساتھ ابتداء ہی سے کچھ دینی سعادتمندی بھی پوشیدہ طور پر چلی آئی ہے جیسا کہ فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرمایا کہ "یوم الزّینۃ" اس سے مراد وہ جشن کا دن تھا جو

دینی فتحمندی کے لحاظ سے حضرت موسیٰ اور ان کے پیرووں کا تھا اور دنیوی خوشی کے لحاظ سے فرعون اور آلِ فرعون کا، پس یہ جشن کا دن باہم مشترک ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی اضافت استعمال نہیں کی یعنی نہیں کہا کہ "یوم زینتکم" (تمہارے جشن کا دن) اس سے معلوم ہوا کہ جشنِ نوروز میں شروع ہی سے دینی فیوضات موجود ہیں۔ اندریں صورت اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ جشن تو فرعون وغیرہ منا رہے تھے، تو اس اعتراض کی کوئی وقعت ہی نہیں، کیونکہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسا کہ کسی زمانے میں "خانۂ کعبہ" میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ دریں صورت معاذ اللہ خانۂ خدا بت پرستوں کی ملکیت تھا، یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

جشنِ نوروز کی اہمیت ہر پیغمبر کے زمانے میں کسی نہ کسی صورت میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کی پوری اہمیت خاتم الانبیاء حضرت محمّد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں ظاہر ہوئی، جسطرح ان کی ذاتِ مطہّرہ پر نبوّت پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی، چنانچہ اس مبارک دن حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیرِ خم کے مقام پر آنحضرتؐ نے بامرِ خدا حضرت مولانا مرتضٰی علی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو درجۂ وصایت پر مامور فرمایا، بروایاتِ معتبرہ یہ یوم سعید ۱۸، ذی الحجہ ۱۰ھ مطابق ۲۱، مارچ ۶۳۲ء کا تھا، مقامِ غدیر کی نسبت سے یہ جشن اسلامی تاریخ میں عیدِ غدیر کے نام سے بھی مشہور ہے، رسول اللہ صلعم پہلے سے ہی جان چکے تھے کہ یہ ان کا آخری حج ہے، اسلئے انہوں نے اس حج کو قبلاً ہی حجۃ الوداع کے نام سے موسوم کیا اور اعلان کیا گیا کہ یہ رسول اللہؐ کا آخری حج ہے، اسلئے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار نفوس رسول اللہؐ کے ہمراہ حج کیلئے روانہ ہوگئے۔ جناب رسولِ خداؐ عرفات کے راستے میں تھے کہ سورۂ الم نشرح نازل ہوئی جس میں ان کے لئے خدا کا ایک عظیم امر یہ تھا:

"فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ" (۹۴: ۷-۸) یعنی "پس اے رسول جب تو (اعمالِ حج سے) فارغ ہو تو (اپنے وصی) کو مقرر کر اور اپنے ربّ کیطرف راغب ہو یعنی دنیا سے کوچ کر۔" پس معلوم ہوا کہ جشنِ نوروز بھی وہاں آکر ظاہر ہوا جہاں مولانا علیؑ کا مرتبہ ظاہر ہوا تھا۔

سلسلۂ بیان کا مذکورہ بالا حصّہ رسمی اور ظاہری جشنِ نوروز سے تعلق رکھتا ہے۔ اب ہمیں چشمِ بصیرت سے یہ دیکھنا ہے کہ جشنِ نوروز کی اس مثال کی حقیقت کیا ہے؟ اور حقیقی مومنوں کیلئے روحانی قسم کا جشنِ نوروز کونسا ہے؟ اور یہ سوال اسلئے پیدا ہوسکتا ہے کہ ہر وہ جشن خواہ دینی قسم کا ہو یا دنیوی نوعیت کا، جب یہ زیادہ سے زیادہ جسمانی خوشی کے اسباب فراہم کرتا ہے تو وہ حقیقی اور روحانی جشن ثابت ہو نہیں سکتا، بنا برین ہر ظاہری عید کے مقابلے میں ایک خالص روحانی عید کا ہونا بھی لازم آتا ہے کیونکہ ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ "یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی بنیاد اپنی خلق (ظاہری دنیا) کیطرح رکھی، تاکہ اسکی مخلوق سے اس کے دین کی دلیل لی جاسکے اور اسکے دین سے اس کی وحدانیت پر دلیل لی جاسکے۔"

اب دینی بہار اور حقیقی جشنِ نوروز کا ذکر یہ ہے کہ جسطرح سورج کائنات کے وسط میں واقع ہے اور وہ اپنی جگہ سے نہیں ٹلتا، اسی طرح امامِ زمان کا ازلی نور ہمیشہ ایک ہی حال پر قائم ہے اور وہ کسی طرح بھی بدلتا نہیں، جسطرح کرّۂ ارض کے مختلف حصّے اس کی روزانہ اور سالانہ گردش میں روشنی اور تاریکی سے گزرتے ہیں اور سورج سے نزدیک و دور ہوتے جاتے ہیں، جسکی وجہ سے زمین کے ان مختلف حصّوں پر دن، رات، بہار، تابستان، خزان اور زمستان کے موسم گزرتے رہتے ہیں، اور جسطرح کرّۂ زمین کے قطبِ شمالی، قطبِ جنوبی

اور دوسرے بہت سے بیابانوں میں فی الحال کوئی آبادی اور موسمِ بہار یا جشنِ نوروز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا، اسی طرح بعض نفوسِ انسانی پر نورِ امامت طلوع ہونے کیلئے ابھی کافی وقت باقی ہے اور جس طرح کرّۂ زمین کے بعض علاقے خطِ استوا یا اسکے قریب ہونے کی وجہ سے اس کی نباتات نہیں مرتیں اسی طرح بعض مومنین ایسے ہیں جن کے دل میں ہمیشہ امامِ زمان کی عقیدت و محبّت کی گرمی قائم رہتی ہے اور ان میں روحانی مسرّت کے پھول کھلتے رہتے ہیں۔ آفتابِ امامت کی فیض بخشی کی یہ مثال خواص و عوام کی اپنی ہی جسمانی و روحانی حیثیت سے ہے۔

اب اس سلسلے میں امامِ زمان کی جسمانی اہمیت و افادیت کی مثال سنئے! کہ سورج اور کرّۂ زمین کے ذریعے نورِ امامت اور نفوسِ انسان کی جو مثال دی گئی ہے وہ حقیقت ہے، لیکن سورج میں اختیار نہیں اور امامِ زمان مختارِ کُلّ ہے، اس لئے ہم اس مثال کی مزید توضیح اسی طرح کرتے ہیں کہ فرض کیجئے روئے زمین پر ایک بہت ہی عجیب اور عظیم آئینہ نصب کیا گیا ہے، اب یہ عجیب آئینہ آفتابِ عالمتاب کا پُرنور عکس لئے ہوئے جسطرف کو رُخ کرلیتا ہے وہیں پر جشنِ نوروز کی خوشی اور موسمِ بہار کی خرّمی و شادمانی ہونے لگتی ہے، یہی مثال امامِ زمان کی ہے کیونکہ وہ جسمانیت کے اعتبار سے فیوضات و برکاتِ خداوندی کا مظہر اور نورِ ازل کا آئینہ ہے۔ اندرین حال عوالمِ اسماعیلیّت کا روحانی موسم ہمیشہ معتدل اور انتہائی خوشگوار رہتا ہے، اور ان عوالم میں ہمیشہ کیلئے بہار ہی بہار ہے، پس حقیقی جشنِ نوروز مومنوں کی انفرادی روحانیت میں پایا جاتا ہے، یعنی ہر مومنِ مخلص کی ابتدائی روحانی ترقی ہی اس کا جشنِ نوروز ہے، اور وہ اسی طرح کہ جب مومن بحقیقت نورِ امامت کا مطیع و فرمان بردار بن جاتا ہے، تو اس کی شخصی دنیائے دل روحانی روئیدگی اور آبادی سے باغِ بہشت کی مثال ہونے لگتی ہے۔

آسمان سے باہر کیا ہے؟

اگر کوئی پوچھے کہ جسمِ کلّی یا فلکِ محیط (سب سے بیرونی آسمان) کی بیرونی سطحی شکل کیسی ہے؟ تو جواب دو کہ گول ہے، پھر اگر پوچھے کہ اس کی کیا دلیل ہے؟ تو جواب دو کہ سُورج، چاند، ہماری زمین (جو ایک سیّارہ ہے)، سیّارات اور ثوابت وغیرہ، سب کی شکل گول ہے اور ان کی گول شکل ہی اس کی دلیل ہے، کیونکہ فلکِ محیط کی گول شکل کے زیرِ اثر ان سب کی شکل گول بنی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ساری شکلوں میں سے صرف گول شکل ہی میں بدرجۂ اتم اعتدال پایا جاتا ہے، اگر فلکِ محیط کی بناوٹ اور شکل میں اعتدال نہ ہوتا تو کائنات کی بنیاد میں ظلم (بے اعتدالی) پایا جاتا اور اس بے اعتدالی کی وجہ سے یہ جہان ٹھہر نہ سکتا اور معدوم ہو جاتا۔

پھر اگر کوئی پوچھے کہ اس فلکِ اعظم (فلکِ محیط) سے باہر کیا ہے؟ تو جواب دو کہ فلکِ اعظم یا فلکِ محیط کے بعد اور کوئی جسم نہیں یعنی نہ فضا ہے اور نہ خلا، بلکہ خلائے موہوم (وہمی خلا) ہے اور حقیقت میں وہ حدِّ لامکان ہے یعنی وہ کوئی جسمانی جگہ نہیں کیونکہ وہ دائرۂ روح کی حدّ ہے، یعنی روحِ کُلّی کا حصار جس پر کُل کائنات کا قیام ہے۔

اگر پھر پوچھا جائے، کہ دائرۂ روحِ کُلّی سے بالاتر کیا شئ ہے؟ تو جواب دو،

کہ دائرۂ روحِ کُلّی پر دائرۂ عقلِ کُلّی محیط (گھیرا ہوّا) ہے، کیونکہ جزوی مثال میں انسانی نفس پر اسکی عقل محیط ہے، اگر پھر سوال کرے، کہ عقلِ کُلّی سے برتر کیا شئ ہے؟ تو اس کا سوال آکر یہاں پر ختم ہو جاتا ہے اسلئے کہ عقلِ کُلّ سے برتر کوئی شئ ہو نہیں سکتی، نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ عقلِ کُلّ سے برتر خدا ہے، اس لئے کہ اگر ہم یہ تصوّر کریں کہ عقلِ کُلّی کے بعد یا اس سے ایک درجہ اوپر خدا کا مقام آتا ہے، تو ہمارے ایسے تصوّرات کے یہ معنی ہوں گے، کہ خدا کا ایک محدود مقام ہے، اور وہ ہمارے علم میں ہے، کہ ہم نے اس کی حد سمجھ لی وغیرہ، ایسے تصوّرات درست نہیں۔

ترکیبِ عالم کی حقیقت یہی ہے کہ جسمِ کُلّی کی بیرونی سطح پر ہر طرف سے نورِ نفسِ کلّی چھایا ہوّا ہے، گویا جملہ کائنات اور اس کے عظیم ترین خولی شکل کا آسمان یا فلکِ محیط نفسِ کُلّی کے اس بحرِ نور میں مستغرق ہے، پھر نفسِ کُلّ کے اس بحرِ نور پر عقلِ کُلّ کا نوری سمندر چھایا ہوّا ہے، چنانچہ اس آیتِ کریمہ سے واضح ہے کہ: "رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَيۡءٖ رَّحۡمَةٗ وَعِلۡمٗا" (۴۰:۷)۔

یعنی "اے ہمارے پروردگار تو نے ہر چیز (کائنات) کو رحمت اور علم میں سمو رکھا ہے"، یہاں پر رحمت سے مراد نفسِ کُلّی اور علم سے مراد عقلِ کُلّی ہے، کہ رحمت صفتِ نفس اور علم صفتِ عقل ہے، پس جس رحمت اور علم میں کائنات سموئی ہوئی ہے، وہ نفسِ کُلّی اور عقلِ کُلّی ہی ہیں، پس معلوم ہوّا کہ عقلِ کُلّ (علم) مدارج و مراتبِ کائنات کا وہ برترین مقام ہے، جس سے کوئی شئ نہ برتر ہے نہ باہر، پھر ہر دانشمند کیلئے یہ ایک ضروری امر ہے، کہ جہاں تک ہو سکے ہر قیمت پر علم حاصل کرے، خصوصاً علمِ دین تاکہ خداوندِ متعال ہر ذی علم کو وہ بلند ترین مرتبہ عطا کرے جو اُس نے عقلِ کُلّ کو عطا فرمایا ہے۔ والسّلام

روحانی مجلس

انسان کی فطرت میں اثر پذیری اور اثراندازی کی دونوں خصوصیات موجود ہیں جن کی وساطت سے بداخلاقی اور خوش اخلاقی کی جملہ صفات ایک انسان سے دوسرے انسان میں داخل ہوسکتی ہیں اور اس قسم کے جسمانی اثرات کی آمدورفت کا پُل محض حواسِ خمسہ ہی کا بنا ہوا ہوتا ہے یعنی موثّر کے قولی یا فعلی اثرات کو متاثر اپنی باصرہ، سامعہ، شامّہ، ذائقہ اور لامسہ کی قوتوں کے ذریعے قبول کرسکتا ہے، پس ہر دانش شعار دیندار کیلئے یہ ایک نہایت ہی ضروری امر ہے کہ وہ اپنے مقدس دینی عقائد کو کسی بھی غیر کی بے حقیقت لفاظی اور تحریر و تقریر کی ملمّع کاری سے بچائے رکھے۔ ایسی اعلیٰ قسم کی روحانی مجالس جن میں عبادت، ذکرِ خاص، منقبت خوانی، علم اور معرفت کی روح افزا مسرّتوں سے لطف اندوز ہونے کے بہترین ذرائع مہیا ہوں تو نہ صرف ہمارے نوخیز اور نوجوان طبقہ کے مقدّس عقائد کو بیرونی اثرات کی ٹھیس لگنے سے محفوظ رکھنے کی ضمانت لیتی ہیں بلکہ اسکے ساتھ ساتھ انہیں صراط المستقیم پر چلاتے ہوئے منازلِ یقین سے گزار دینے کی پوری امکانیت بھی رکھتی ہیں اور ہر عارف کو مقامِ وحدت یعنی "هو الکُلّ" (ہمہ اوست) کی آخری منزل راحت گاہ تک پہنچا سکتی ہیں۔

روحانی مجلس ہی وہ واحد ذریعہ ہے، جس کی بدولت ہر حقیقی اسماعیلی

اعتقادی خوبیوں کو اپنانے کے بعد امامِ حیؑ و حاضر کی حقیقی محبت کے نورانی نتائج سے محظوظ اور مسرور ہو سکتا ہے اور وہ اپنے اعلیٰ واقدس دین کے روحانی جوہر کا پتہ لگا سکتا ہے جو عجائباتِ نورانی اور معجزاتِ روحانی سے بھرپور ہے، جن کے مشاہدات سے تجرباتی علم اور یقینِ کامل حاصل ہو کر اس حقیقی اسماعیلی کا دل پکار اٹھتا ہے کہ میرا عقیدہ اور میرا مذہب سچا ہے۔ روحانی مجلس میں مخلص عقیدت مندوں کی ہم خیالی، یک جہتی، کثرتِ ذکر اور سب سے بڑھ کر غیبی مدد کی برکات سے حقیقی مومنوں کے روحانی عروج و ارتقاء کی جو رفتار ہوتی ہے وہ ایک ایسی سریع العمل مشین کے کام سے مشابہت رکھتی ہے جو اپنی رفتار کی سرعت اور اپنے پُرزہ جات و آلات کی کثرت کے ذریعے کم عرصے میں بہت سا کام کر سکتی ہو۔ مزید برآن یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ اگر یہ حقیقت مسلّمہ ہو کہ ہر دنیاوی مشکل کام جو کسی اکیلے فرد سے ہو نہیں سکتا وہ کسی جمعیت سے بآسانی انجام پا سکتا ہے، تو یہ بھی ایک حقیقی امر ہے کہ مومنوں کی اجتماعی دعا، عبادت، ذکر اور دوسرے تمام جماعتی روحانی امور ہر مومن کی انفرادی اور جداگانہ سعیٔ روحانیت کے مقابلے میں بہت ہی آسان اور دُوررَس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

عبادت خانہ اور روحانی مجلس سے وہ حقیقی مومن خاطر خواہ اور پورا فائدہ حاصل کر سکتا ہے، جس کا دل نورِ ایمان سے روشن ہوا ہو، جس کو عبادت سے خوشی اور لذّت ملتی ہو، جو امامِ زمان کی فرمانبرداری میں اپنی بہتری دیکھے، جس کے خیال اور دل میں مولا کی یاد ہمیشہ لگی رہے، جو اپنے روحانی بھائیوں اور بہنوں کا خیر خواہ ہو سکے، جس کو دینی علم کی باتیں سننے کا شوق ہو اور جو پرہیزگار اور نور کا عاشق ہو۔

انسان میں اثر پذیری اور اثراندازی کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ خدا کی مدد سے اور علم و عبادت کے ذرائع سے اپنے آپ پر معقول اور پسندیدہ

اثرات ڈالنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ بنابریں ہر ذاکر نہ صرف دوسرے ذاکروں کے اخلاقی و روحانی اثرات سے مستفید ہوسکتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ عاجزانہ عبادت، دعا اور ذکر کی بدولت اسکو اپنے آپ پر روحانی اثرات ڈالنے کا بہترین موقع بھی میسّر آتا ہے۔

انسانی روح اپنی ازلی حالت میں خدا کے نور سے بنی ہوئی تھی اور اسمیں غیب بینی، غیب دانی اور ہمہ توانی کی جملہ صفات موجود تھیں، لیکن جب سے اس نے جامۂ خاکی اختیار کیا تو دنیوی اور جسمانی آلائشوں سے یہ زنگ آلود ہوئی اور اس کے آئینۂ غیب نما پر تاریکیٔ نفسانیت چھاگئی، پھر اس میں وہ خصوصیات باقی نہ رہیں، جن کی بدولت یہ لوحِ محفوظ کی مانند تھی، پھر ستم پر ستم ہے کہ اگر اس گنجِ گرانمایہ سے غفلت برتی جارہی ہو جو دونوں جہان کے علم و عمل کی لذّتوں کا خلاصہ ہے، ایسی روح کی پاکیزگی اور صفائی کے بارے میں اور اس سے غافل رہنے کے نتیجے کے متعلق خدائے پاک فرماتا ہے کہ:

"قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا۔" (۹۱: ۹-۱۰) یعنی "بے شک رستگار ہوا، وہ شخص جس نے اُسے پاک کیا اور نامراد ہوا وہ شخص جس نے اُسے دفنایا"۔ پس روح کی پاکیزگی کا بہترین طریقہ روحانی مجلس ہے جسمیں ہر ایک حقیقی مومن اپنے آئینۂ روح کو پاک وصاف کرکے اُسے از سرِ نو غیب نما حالت پر لاسکتا ہے، جس طرح یہ ازل میں تھا، اسکے برعکس وہ انمول آئینہ جہالت کی ظلمتوں اور بدعملی کی گرد و غبار میں دفنایا ہوا پڑا ہے اور یہ صورت ابدی نامرادی کا پیش خیمہ ہے، پھر حقیقی مومن کا یہ اوّلین فرض ہے کہ خدا کی اس مقدّس امانت کو جو اسکے عالم گیر نور سے بنی ہوئی ہے اسی طرح دبی اور دفنی ہوئی حالت میں نہ رکھے، بلکہ اُسے چاہیئے کہ اپنی دنیاوی زندگی کے روزانہ اوقات کا بیشتر حصّہ خدا کی اس مبارک امانت کی

پرورش و نگہداشت اور اس کی پاکیزگی میں صرف کرے۔

والسّلام

تاویلِ سُورۂ کوثر

"اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ۔" (۱۰۸ : ۱-۳)۔ یعنی "اے محمدؐ ہم نے تجھ کو کوثر عطا کیا ہے، پس تو نماز پڑھ اور اونٹ کو نحر کر، یقیناً تیرا دشمن خود ہی دُم بریدہ ہے۔"

الۡكَوۡثَرَ: الکوثر کے معنی ہیں خیرِ کثیر، بہشت کا ایک چشمہ، وہ مرد جس کی بہت سی اولاد و احفاد ہوں، یعنی کثیر الذّریّت، اور وہ سردار جو بہت کچھ خیر و عطا کرتا ہو، لیکن یہاں لفظ "الکوثر" سے مراد مردِ کثیر الذّریّت ہے، کیونکہ کلام کے موضوع سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں با اولاد اور بے اولاد کا ذکر مقصود ہے۔

الصَّلٰوۃ: الصّلوٰۃ کے معنی ہیں نماز، دُعا، ثناء، تسبیح، رحمت، درود ملنا، پیروی اور خدا کی طرف عقل کی بلندی، مگر یہاں "صَلِّ" سے مراد دینِ حق کی دعوت ہے، یعنی سچّے دین کی طرف بلانا۔ چنانچہ ناصر خسروؒ کتاب وجہِ دین میں فرماتے ہیں کہ "تاویلِ نماز دعوت است" یعنی نماز کی تاویل دعوت ہے (ص: ۱۳۰ مطبوعۂ برلین)۔

اونٹ: اونٹ کئی وجوہ سے درجۂ ناطق کی مثال ہے، جن میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جسطرح جملہ حیوانات میں سے صرف اونٹ ہی ایک ایسا کارآمد جانور

ہے، جو تعجب خیز صبر و تحمّل اور سخت جانی سے ایک بہت بھاری بوجھ اٹھاتے ہوئے دور و دراز سفر طے کرتا ہے، اسی طرح سارے انسانوں میں سے تنہا ناطق ہی وہ انسانِ کامل ہے جو اپنی اولوالعزمی اور صبر و استقلال کیساتھ حکمِ خداوندی کے بارِ گران کو دنیا سے آخرت تک پہنچاتا ہے۔

نحر کرنا: نحر کرنے کے معنی ہیں اونٹ کو ذبح کرنے سے پہلے اسکے سینہ اور دل کو چاک کرنا تاکہ اس کے دل سے خون نکل جائے جس کی تاویل ہے درجۂ ناطقیّت کی تمامی کے بعد ناطق کی طرف سے اساس کا تقرر کرنا۔

جس وقت آنحضرتؐ کے دشمنوں میں سے ایک نے اپنی جہالت، عداوت اور کفر کی بنا پر یہ طعنہ دیا کہ "محمدؐ دُم بریدہ ہے یعنی اس کا کوئی نرینہ فرزند نہیں اور نبوّت کے اس دعویدار شخص کا کوئی وصی یا جانشین نہیں ہوگا" تو اسی وقت خدائے تبارک و تعالیٰ نے سورۂ مذکورہ کے نزول سے اس کافرانہ طعنے کی تردید فرماتے ہوئے آنحضرتؐ کو اس طرح مطمئن کر دیا کہ "اے محمدؐ ہم نے تجھ کو ایک ایسا کثیر الذّریّت مرد عطا کیا ہے جو ہر نسبت سے تیرا ہی ہے اور وہ علیؑ المرتضیٰؑ ہے، یہی تیرا وصی اور جانشین ہوگا جس کے غیر منقطع سلسلۂ ذرّیّت سے ہونے والے ائمّہ تیری اولاد کہلائیں گے اور وہ یومِ قیامت تک تیرے پیارے دین کو ظاہراً و باطناً علم و حکمت کے چراغوں سے فروغ دیتے رہیں گے، پس تو دشمنوں کی باتوں کی کوئی پرواہ نہ کر اور دینِ حق کی دعوت جاری رکھتے ہوئے درجۂ اساسیّت پر علیؑ کا تقرر کر، اور یقین کر، تو نہیں بلکہ تیرا دشمن خود ہی دُم بریدہ ہے یعنی اسکی کوئی اولاد باقی نہ رہے گی۔"

والسّلام

طریقِ استعانت

انسان اپنی فطرت اور خودی کی طرف سے ایک ضعیف مخلوق ہے، اور اس کے عاجز و ناتوان پیدا کئے جانے میں کسی کو کوئی شک ہی نہیں، جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ: "وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا"۔(۲۸:۴) "اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے" جسکی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ انسان خدا کی مدد طلب کرنے کے انداز پر پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ ان تمام نیک اقوال و اعمال کے ذریعے ہمیشہ کیلئے خدا کی یاد کے ساتھ وابستہ ہو سکے، جن کے بغیر خدا کی مدد حاصل کی نہیں جاسکتی ہے، پس انسان کی فطری ناتوانی خود اس امر کی دلیل ثابت ہوئی، کہ وہ ہمیشہ کیلئے خدا کی مدد کا محتاج ہے، پھر ہر مومن کیلئے یہ ایک لازمی امر ہے، کہ وہ لمحہ لمحہ خدا سے مدد طلب کرتا رہے اور اپنی اس احتیاج کے عاجزانہ احساس کو کسی وقت بھی ختم نہ ہونے دے۔

اس مقام پر اگر کوئی یہ سوال کرے، کہ دُنیا میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں، جو نہ تو خدا کی عبادت کرتے ہیں اور نہ خدا سے کوئی مدد چاہتے ہیں، لیکن اسکے باوجود بھی وہ نسبتاً کامیاب ہوتے جاتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے، کہ ان کی یہ کامیابی جسمانی قسم کی ہے، اور اسکی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک وہ نام نہاد کامیابی ہے، جس کے فائدے ان لوگوں کی اپنی ذات یا ان کے چاہنے والوں تک محدود ہوتے ہیں تو یہ ان کی نام نہاد کامیابی دراصل خدا کی طرف سے دی ہوئی ایک اچھی مہلت

ہے "وَاهْجُرْهُمْ هَجْراً جَمِيلاً"۔ (۷۳:۱۰) دوسری وہ کامیابی ہے جسکے فائدے خلقِ خدا کو پہنچتے ہیں، تو یہ دنیاوی بہتری ہے، اور اس میں ایک حد تک خدا کی خوشنودی ہے، پس یہ دنیا بھر کے دینداروں کی اس دُعا کا ایک پھل ہے، جسمیں وہ دنیا و آخرت کی بہتری طلب کرتے رہتے ہیں، نیز وہ لوگ جو ہمہ رَس مفید کاموں میں کامیاب ہوئے ہیں، دل و زبان اور سوچ سمجھ سے نہیں بلکہ عملی اور لاعلمی طور پر خدا سے ایک قسم کی دنیاوی مدد طلب کرتے ہیں۔

اب استعانت کی اہمیت کے بارے میں یہ ہے، کہ قرآنِ حکیم میں جہاں کہیں بھی خدا کی مدد کا ذکر آیا ہے۔ وہاں پر ہی اس مطلب کی ایک تفصیل بھی پائی جاتی ہے، اور ان تفصیلات کی تحقیق کے آخری نتیجے میں ہمیں یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، کہ جس طرح انسان کی تخلیق کے تذکرے میں اسکی فطری کمزوری سب سے پہلی چیز ہے، اور جسطرح اس کی احتیاجات میں سے خدا کی مدد سب سے زیادہ ضروری اور سب سے مقدم ہے، بالکل اسی طرح قرآنی تعلیمات میں طلبِ تائید کی تعلیم اور اس کا اصول سب سے پہلے آیا ہے، پھر اس سے ہر دانشمند یہ یقین کر سکتا ہے، کہ طلبِ تائید ہر مومن کیلئے ایک ضروری امر ہے، اس لئے کہ اس کا ذکر قرآنِ پاک کی ایک ایسی سورت میں آیا ہے جو نہ صرف امّ الکتاب اور سبع المثانی کی حیثیت سے ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک ایسی پسندیدہ سورت ہے، جو دُعا و عبادت کے طور پر کثرت سے پڑھی جاتی ہے۔

اب طریقِ استعانت کے بارے میں یہ ہے، کہ سورۃ الفاتحہ کی جس آیت میں خدا سے مدد طلب کرنے کا ذکر آیا ہے، وہ اس سورہ کی چوتھی آیت ہے اگر ہم اصولاً شروع کی تین آیات کے اعداد و شمار نکالیں، تو وہ یہی ہوں گے: آیات = ۳، الفاظ = ۹، مقطع = ۱۹، اور حروف = ۴۰، آیات اور الفاظ کے اعداد کے بارے میں

آپ میں سے کسی کو شک نہیں ہوگا، اس لئے ہم یہاں صرف مقطعوں اور حروف کے اعداد کو واضح کر دیتے ہیں :

١	٢	٣	٤	٥	٦	٧	٨	٩	١٠
ا	لحمد	لله	ر	ب	ا	لعلمین	ا	لر	حمن
١	٥	٨	٩	١٠	١١	١٧	١٨	٢٠	٢٣

١١	١٢	١٣	١٤	١٥	١٦	١٧	١٨	١٩
ا	لر	حیم	ملک	یو	م	ا	لد	ین
٢٤	٢٦	٢٩	٣٢	٣٤	٣٥	٣٦	٣٨	٤٠

اب ٣، ٩، ١٩ اور ٤٠ کی علی التّرتیب تاویل یہ ہے کہ استعانت کے ذکر سے پہلے آیات کے شمار میں تین (٣) کا ہونا اس حکمت کا اشارہ ہے، کہ مومن سب سے پہلے اس ذریعۂ استعانت کی طرف متوجہ ہو جائے، جس کا عددی نشان تین ہے، تو ہر دانشمند جانتا ہے، کہ وہ مومن کی قوّتِ اطاعت ہے، جو تین حصّوں میں منقسم ہے، یعنی نیّت، قول اور عمل، کیونکہ مومن اپنے دین و ایمان کی تکمیل انہی تین (٣) قوتوں کے ذریعے کر سکتا ہے، پس ظاہر ہوا کہ استعانت کی پہلی شرط مومن کی نیّت، قول اور عمل کی درستی ہے جو ابتدائی اطاعت کے عنوان کے تحت آتی ہے، پھر ان تین آیات میں نو (٩) الفاظ آنے کا اشارہ یہ بتاتا ہے، کہ مومن کی نیّت، قول اور عمل کی اصلاح بحقیقت اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ وہ ایک ایسے ذریعے کو پہچانے جس کا عددی نشان نو (٩) ہے، تو وہ اساس یعنی مرتضیٰ علیؑ ہے، جو خدا و رسولؐ کے علوم و معارف کا باب ہے، پس استعانت کی دوسری شرط اساس کی پہچان ہے، پھر ان نو (٩) الفاظ کے انیس (١٩) مقطع یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ مومن اساس کے علوم و معارف سے بحقیقت اس وقت مستفیض ہو سکتا ہے، جب کہ وہ

ایک ایسے وسیلے کو پہچانے جس کا عددی نشان انیس (۱۹) ہے تو وہ دَورِ کہین (ذیلی دَور) کے سات امام اوران کے بارہ حجّت ہیں، اور امامِ زمان ان کا مظہر ہے، پس استعانت کی تیسری شرط امامِ زمان کی پہچان اوراسکی فرمان برداری ہے، بعدازان انیس (۱۹) مقطع کے چالیس (۴۰) حروف کا ایما یہ بتاتا ہے کہ امامِ زمان کی معرفت اور فرمانبرداری کا حق مومن سے اس وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ وہ ایک ایسے ذریعے کو پہچانے جس کا عددی نشان چالیس (۴۰) ہے، وہ ناطق یعنی حضرت محمدؐ ہے، جو صرف امامِ زمان کے ذریعے سے پہچانا جاتا ہے، پس معلوم ہوا کہ استعانت کی چوتھی شرط ناطق کی پہچان ہے، جو علم و حکمت کا شہر ہے۔

اب مذکورہ بالا شرائط کی تکمیل کے بعد تائیدِ ایزدی کا دروازہ مومنین کیلئے کھلتا رہے گا، اور وہ اپنی دعا میں جب یہ کلمہ پڑھیں کہ: "اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ" تو ان کے یوں کہنے میں علم و عمل (نیّت، قول اورعمل کی درستی) کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سچائی ہوگی، کیونکہ مومنین اس کلمہ میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہیں، اور وہ علیم و حکیم سے یوں گذارش کررہے ہیں، کہ: "(اے ربُّ العزّت) ہم (کسی اور کی نہیں صرف) آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں، اور (کسی دوسرے سے نہیں صرف) آپ ہی سے درخواستِ اعانت کرتے ہیں"۔ پس یہ کلمہ خدا کے بارے میں کئے ہوئے وہم و گمان اور مقلّدانہ عبادت کے تعلق سے بالاتر رہ کر حقیقی مومنوں کے علم و عمل یعنی معرفت کی ترجمانی کرتا ہے، اور اس استحقاق کی بنا پر ان کی طرف سے ربّ العزّت کے حضور میں درخواستِ اعانت کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز یہ کلمہ اپنے ربط و ترتیب کے ذریعے یہ حقیقت ظاہر کرتا ہے، کہ اعلیٰ قسم کی روحانی تائید عبادت و معرفت کا لازمی پھل ہے اور عبادت و معرفت علم و عمل کا مجموعی نام ہے جسکی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کا ذکر عبادت کے ذکر کے

بعد آیا ہے اور عبادت کے ذکر سے پہلے علم، معرفت اور عمل کا ذکر آیا ہے، چنانچہ ارشادِ خداوندی کا ترجمہ یہ ہے کہ: "(ہم نے ترجمانِ اسلام کے ذریعے یہ سمجھا کہ) خاص ستائش اللہ کو ہے، جو (آفاق و انفس کے بیشمار) عالموں کا پروردگار ہے، جو بڑا مہربان ہے (دُنیا میں سب کیلئے) نہایت رحم والا ہے (آخرت میں مومنوں کیلئے) جو مالک ہے روزِ جزا کا" پس یہی ہے طریقِ استعانت جس کی بقدرِ ضرورت تفصیل ہوئی، بفضلہٖ و منّہٖ۔

سیّاروں میں انسان کی سیاحت

انسانی زندگی کا قیام و دوام اُس سلسلۂ حرکات پر ہے جو ہمیشہ غیر منقطع حالت میں انسان کے مدرکات وحواس میں جاری و ساری ہے اور اس سلسلہ کے کلّی طور پر انقطاع ہونے کا نتیجہ اس کی جسمانی موت ہے۔ فی المثل اگر ہم بطورِ تجربہ اپنے قول و عمل کے سِلسلۂ حرکات چند لمحات کیلئے منقطع کر کے خاموشی اختیار کر بیٹھیں، تو ہمارا یہ سکوت وسکون قطعی اور حقیقی ہو نہیں سکتا کیونکہ ہمارے جوف میں حرکتِ تنفّس تو دھونکتی جارہی ہے، پھر اگر ہم چند سیکنڈ کے لئے اپنی حرکتِ تنفّس کو روکنے پر قادر بھی ہو جائیں، تو ہماری قلبی حرکت خود ہمارے قابو کی شئے نہیں، جسے ہم کسی اعلیٰ ترین تجربے کے بغیر روک ہی نہیں سکتے، اس کے علاوہ ہم اپنے دل و دماغ کے سلسلۂ فکر و خیال اور غیر منظم ذہنی قیل و قال کو بھی آخری حدّ تک منقطع نہیں کر سکتے ہیں، بجز آنکہ تزکیۂ نفس کے ذریعے اس ذہنی قیل و قال یا حدیثِ نفسی کو نورانی ہدایت اور الہامی روح کے تصرّف میں سونپ دیں۔ نیز اگر ہم اس تجربۂ سکوت کی غرض سے اپنے آپ کو نیند کے حوالے کر دیں، تو پھر بھی ہم اپنے بعض مخصوص مدرکات کو خاموش اور ساکن نہیں پا سکیں گے، بالخاصہ ہماری قوتِ واہمہ تو عالمِ خواب میں بیداری سے کہیں زیادہ اپنے طور کا سِلسلۂ قول و عمل جاری رکھے گی۔

اب ہمارے اس تجربے سے یہ ثبوت ہوا، کہ ہم اپنے مدرکات و حواس کے سلسلۂ عمل (حرکت) کو کُلیتہً منقطع نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ ہماری زندگی کا چراغ ہماری ذہنی و خارجی مسلسل حرکات کے ذریعے روشن ہے، جس طرح کوئی مادّی قسم کا چراغ اپنی غیر منقطع بتّی اور اس پر تیل کی مسلسل دوڑ کے ذریعے روشن ہو جاتا ہے، اور اگر اس چراغ کی بتّی منقطع ہو جائے یا اس کے شعلے تک تیل کی ایک ضروری مقدار مسلسل بہتی یا ابھرتی نہ رہی، تو یہ چراغ فوراً ہی خاموش ہو جاتا ہے اسی طرح ہماری زندگی کا چراغ تسلسلِ عمل کی بتّی اور تواترِ قول کے تیل سے روشن ہے، خواہ یہ سلسلہ ہمارے مدرکاتِ باطنی کا ہو یا حواسِ ظاہری کا، اگر یہ سلسلہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی منقطع ہو جائے تو فوراً ہی ہماری شمعِ حیات بجھ جائے گی۔ اس صورتحال کا مطلب یہ ہوا، کہ انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو لحظہ بہ لحظہ بہتر سے بہتر بنانے کیلئے دین و دنیا میں مفید معلومات اور پسندیدہ اعمال کے ایک لاانتہا سلسلے کا جاری ہونا ازبس ضروری اور ایک ناگزیر فطری تقاضا ہے۔

پس یہی وجہ ہے، کہ خدائے حکیم نے کتبِ سماوی اور انبیاء و اولیاءؑ کے ذریعے اسرارِ کائنات کو دفعۃً ظاہر کر کے نہیں رکھا، بلکہ انسان اس امر کیلئے مکلّف ہوا، کہ وہ ان مقدس ذرائع سے بمقتضائے زمانہ اسرارِ کائنات کو بتدریج معلوم کرتا جائے، تاکہ انسانی فکر و عمل کے اس تسلسل سے چراغِ حیاتِ بشری اپنے علم و ہنر کے عروج و ارتقاء میں کچھ اس طرح روشن ہو سکے، کہ نہ تو وہ بجھنے پائے اور نہ ویسے کا ویسا رہے، اور نہ یکایک اتنا روشن ہو، کہ چشمِ گیتی اس کے نورانی تموّج سے خیرہ ہو جائے، بلکہ اسکی روشنی میں بتدریج اضافہ ہوتا جائے، بس حیاتِ انسانی کا یہی بہترین طریقہ ہے جو قانونِ قدرت کے منشاء کے عین مطابق ہے۔

پس اگر اس حقیقت کو مان لیا جائے کہ دورِ حاضر کے موجودہ مادّی ارتقاء

کا یہ لاانتہا سلسلہ قانونِ قدرت کے منشاء کے عین مطابق ہے تو درین صورت ہم کس دلیل کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں، کہ روحانی عروج ناممکن ہے، جب کہ یہ امر یقینی ہے، کہ روحانیت کی بہت سی مثالیں سائنسی ایجاد و انکشاف کی صورت میں ظہور پذیر ہو چکی ہیں، جن کے ذریعے عالم گیر روحانی طاقت کے قول و عمل کا سمجھنا نسبتہً زیادہ آسان ہونے لگا ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ ہم کس طرح اس حقیقت کو ذہن نشین کرسکیں، کہ ہماری موجودہ زندگی کا مکمّل کارنامہ روحانیت میں مکتوب و محفوظ ہوتا جارہا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے، کہ زندہ تصویرکشی کے طریقے پر مکتوب ہوتا جارہا ہے، آپ نے دیکھا کہ اس فقرہ کے ذریعے تفہیمِ روحانیت کے لئے آپ کے خیال کو کس چیز کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے، وہ وہی چیزیں ہیں جن کا نام ٹیلیویژن وغیرہ ہے، جو یہ سب سائنس کی بدولت پیدا ہوئی ہیں، پھر آپ اس کلیدی اصول کے ذریعے اپنی ذات کے ایسے بہت سے عقدے کھول سکتے ہیں۔

چنانچہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ درست اور بجا ہے، کہ وہ باعزت فرشتے جن کا نام "کِرَامًا کَاتِبِیْنَ" (۸۲:۱۱) ہے، جن کے بارے میں یہ بات سمجھ میں آئی تھی، کہ کاتب ہی کی طرح وہ بھی لکھتے رہتے ہیں اب معلوم ہوا، کہ ان کا کام ہماری تاریخِ زندگی کو روحانی طرز کا ٹیلیوائز کرنا ہے، آگے چل کر آپ کہہ سکتے ہیں، کہ دانشمندی تو یہی ہے، کہ انسان کے تمام ظاہری و باطنی احوال روحانی قوتوں کے ذریعے خود بخود ٹیلیوائز ہوتے جاتے ہیں، اور ان قوتوں کا نام "کِرَامًا کَاتِبِیْنَ" ہے، اور اس نام میں خود یہی مطلب پوشیدہ ہے، یعنی (کاسبانہ محنت کے طور پر نہیں بلکہ) حاکمانہ عزّت و دانش کے طور پر لکھنے والے۔

اب ہم قرآنِ حکیم کی حکمت اور اسلامی روح کے سہارے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کرنا چاہتے ہیں، جس سے یقیناً یہ ثابت ہوگا کہ مذہب میں

سائنس اور سائنس میں مذہب پوشیدہ ہے، وہ یہ ہے کہ قانونِ قدرت نے اپنی بے پناہ فیاّضی سے ذاتِ انسانی کیلئے لامحدود قوتیں اور بے پناہ نعمتیں وقف کر رکھی ہیں، اور ان قوتوں کو اپنا کر ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کیلئے انسان کو مِن حَیثِ المَجمُوع ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، نیز اس سلسلے میں اسے یہ بھی سوچنا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات اور عجیب و غریب آلات (ریڈیو، ٹیلیویژن، راکٹ وغیرہ) کے موجد و صانع ہونے کے باوجود اس کی اپنی ذات وہ کام نہیں کرسکتی ہے، جو کچھ اس کا بنایا ہوًا ایک آلہ کرسکتا ہے، پھر رفتہ رفتہ ایک دن اس کے خیال میں یہ بات پیدا ہوگی کہ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انسان نے اپنی ذات کی طرف کبھی کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟

پس اس مقام پر یہ کہنا حقیقت پسندی ہوگی کہ انسان کا موجودہ جسم و دماغ ہر لحاظ سے ہنوز خام و ناتمام ہے اور اسے ایک نہ ایک دن "خَلقُ الآخر" کا کمال حاصل کرنا ہے۔ خلقُ الآخر جسمِ لطیف (جسمِ مثالی) کا نام ہے، جو گرمی، سردی، خشکی اور تری کے اثرات سے بالاتر ہے، اس لئے کہ وہ جسم جوہری (ایٹمی) ہے، جسدِ عنصری نہیں، جس کو اپنانے کے بعد ہی انسان ان تمام بیرونی مادّی آلات سے بے نیاز ہوسکتا ہے، جس کی تخلیق کے بارے میں اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ کی تعریف آپ ہی کرتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے: "پس بہت برکت والا ہے اللہ تعالیٰ، جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔" (۲۳:۱۴) اس ارشاد سے یہ مطلب ظاہر ہے، کہ جسمِ لطیف ہی قدرتِ کاملہ کے تخلیقی اوصاف و کمالات کا مظہر ہے، اور دیگر صناعوں نے جو کچھ بھی اب تک ایجاد کیا ہے، یا جو کچھ بھی ان سے ایجاد ہونے والا ہے، وہ سب کے سب جسمِ لطیف کے مقابلے میں ہیچ ہے اس لئے کہ جسمِ لطیف روحانی عجائبات و غرائبات کا ایک لاانتہا خزانہ ہے۔

اس سلسلے میں ہم ان ابتدائی انسانوں کے اجسام کے متعلق کچھ حقائق بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو حضرت آدم و حضرت حوّا علیہما السّلام وغیرہ کے نام سے سیّارۂ زمین پر اتر آئے تھے، وہ صرف تین یا پانچ نفر نہ تھے، بلکہ وہ ایک دنیا بھر کی مخلوق تھی، جب ان پر وہاں (بہشت) یعنی ایک انتہائی معمور سیّارے میں ایک دَورِ عظیم گذر چکا، تو انہیں طوعاً وکرھاً سیّارۂ زمین پر منتقل ہونا پڑا، جیسا کہ اس کا ذکر قرآنِ پاک میں موجود ہے کہ "ہم نے کہا تم سب اس (سیّارۂ بہشت) سے نیچے اترو" (۳۸:۲) اب اس ارشاد کا خلاصہ "تم سب اترو" کو لیتے ہیں، جس سے اوّل تو یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس سیّارے کی ساری خلقت زمین پر اتر آئی تھی، دوسرا یہ کہ کسی اور طاقت نے ان سب کو سیّارۂ بہشت سے اٹھا کر سیّارۂ زمین پر منتقل نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنے جسمِ لطیف کے جوہری پرواز سے اس زمین پر وارد ہوئے کیونکہ ارشادِ الٰہی اتر جانے کیلئے ہے اتار دینے کیلئے نہیں، نیز یہ کہ اگر ان میں جوہری لرزش کی پرواز کی صلاحیت موجود نہ ہوتی، تو خدائے حکیم یہ نہ فرماتا کہ "تم سب اترو" کیونکہ بموجبِ "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" (۲۸۶:۲) یعنی "اللہ تعالیٰ ہر ذی حیات کو اس کی توانائی سے زیادہ عمل کی تکلیف نہیں دیتا ہے"، اگر ایسے جسمِ لطیف کا ترجمہ دَورِ حاضر کی ایک سائنسی اصطلاح سے کرلیا جائے تو "ایٹمی جسم" اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے، پس حضرت آدم علیہ السّلام اور اس کے تمام ساتھی وغیرہ اپنے ایٹمی اجسام میں سیّارۂ زمین پر نازل ہوئے تھے، لیکن اس زمین کی ہوا میں تحلیلی لطافت کی کمی، خورد و نوش اور کام کاج وغیرہ کے نتیجے میں ان میں جسمِ طبیعی پیدا ہوا، اور ایٹمی جسم ان سے جدا رہنے لگا، حضرت آدم، حضرت حوّا اور چند دیگر خواص اس صدمۂ جانکاہ سے بہت دلگیر ہوئے اور وہ اس فکر میں تھے کہ ایک روز حضرت آدم علیہ السّلام کیلئے ہدایت آئی کہ ان کلمات کو عجز و نیاز کے اس طریقے

پر پڑھ لیا کرو (۲:۳۷) کچھ عرصے کے بعد اس عبادتِ خاص کی برکت سے جسمِ لطیف کی ملاقات ان کو میسّر ہوتی رہی۔

اس واقعہ کے بعد نئی نسل کے ہر مرد و زن کے ایٹمی جسم کی تکمیل اس کے سنینِ معصومیت کے اختتام تک ہوتی رہی، پھر عنفوانِ شباب کے پہلے خواب کے نتیجے پر اس سے علیحدہ رہنا قرار پایا۔ اسکے ساتھ ساتھ اسے بار بار واپس بُلا لانے کیلئے تزکیۂ نفس وغیرہ کے خاص و عام طریقے بھی مقرر ہوئے جن کے ذریعے صفِ اوّل کے انسانوں نے نہ صرف یہی کچھ کیا، کہ اپنے ابتدائی جسمِ مثالی پر قابو پایا، بلکہ اسکے علاوہ ان کے جسمانی سانچوں میں، جو ضروری حد تک پاک و صاف تھے قدرتی زندہ ہیولیٰ (جوہری مادہ) ڈھل کر جسمِ مثالی کی صورت میں متعدد بار برآمد ہوتا رہا۔

آتشِ نمرودی کے تباہ کن اثر سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے معجزانہ طور پر بچ نکلنے کی حقیقت بھی یہی ہے، کہ جب ان کو آگ کی طرف پھینک دیا گیا، تو پہلے جھٹکے ہی میں انکے مرکزِ دل سے جسم کی سطح کی طرف برقِ تخوّف کی ایک لہر سی دوڑ نکلی، یہ ان کیلئے فوری اور قدرتی قسم کا تزکیۂ نفس تھا، جس میں نفسِ حیوانیہ نے بمجبوریٔ خوفِ فنا اپنی جگہ جسمِ لطیف کیلئے چھوڑ نکلی، اور اپنی قسم کی سرعت سے ایٹمی جسم نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی نفسِ حیوانیہ کی جگہ ہَوا ہی میں لے لی، اب چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام ایٹمی جسم میں مستغرق تھا، جسکے ذریعے وہ نہ صرف اس دہشت خیز آگ کے اثر سے محفوظ رہا، بلکہ اس کے علاوہ ایٹمی جسم کی نورانیت میں اسکے دل و دماغ روشن سے روشن تر ہوئے، یہاں تک کہ اس کے خیال کی تصریفی قوّت نے اُس طوفانِ آتشین کو ایک عجیب شاداب و خرّم اور پُر رنگ و بُو گلشن کی صورت میں دکھایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے سولی پر چڑھائے جانے میں خدائے برتر کے اذن سے جسمِ مثالی نے جوکچھ اسکی امداد کی ہے، وہ بھی اسی طرح کی ہے، مگر اس میں فرق صرف اتنا ہے، کہ خدائے حکیم نے حضرت مسیّح کو سولی کی کوئی تکلیف پہنچنے سے پہلے ہی اس کی کمال یافتہ روح کو اُن سات سیّاروں میں سے چوتھے پر پہنچایا، جن سے ہماری زمین اور دیگر چھ سیّارے مستفیض ہوتے ہیں، اندراں حال چشمِ زدن میں اس کے جسدِ عنصری میں جسمِ مثالی نے حلول کرلیا اور منکرین نے محض حضرت عیسیٰ کے جسدِ عنصری ہی کو پھانسی دے دی مگر اس میں جسمِ مثالی ان کا مذاق اڑاتا تھا، کیونکہ وہ لوگ اپنی اس جاہلانہ حرکت سے نہ تو حضرت عیسیٰ کو کوئی تکلیف پہنچا سکتے تھے اور نہ جسمِ مثالی کا کچھ بگاڑ سکتے تھے۔

حضرت یوسف علیہ السّلام نے جو مصر میں مقیم تھے، اپنے جسمِ مثالی (نورانی قمیص) کو اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السّلام کی طرف روانہ کردیا، جو کنعان میں تھے، الغرض انبیاء و اولیاء کے تمام تر معجزات و کرامات کا سرِّ عظیم جسمِ مثالی یعنی ایٹمی جسم کی تسخیر میں پوشیدہ ہے اور ان میں سے ایسا کوئی نبی یا ولی نہیں گزرا ہے، جس کو مصلحتِ وقت اور اس کی ضرورت کے مطابق جثۂ ذُروی (ایٹمی جسم) سے خاطرخواہ مدد نہ ملی ہو۔

جناب سرورِ کائنات و فخرِ موجودات اور ان کے بعض پیارے حضرات تو خود ہمیشہ اس مرکبِ برق رو کے راکب اور اس میدانِ روحانیت کے شہسوار تھے، چنانچہ معجزۂ معراجِ نبوّی کے مرکب کا نام بُراق ہے، اور لفظ بُراق کا مادّہ برق ہے، جس کے معنی بجلی کے ہیں، پس بجلی اور ایٹم ایک ہی جوہر کے دو نام ہیں، پھر ظاہر ہوا کہ مرکبِ معراجِ نبوّی ایٹمی جسم تھا، خواہ اس نے ایک مخصوص جانور کی شکل اختیار کرلی ہو، یا فرش رف رف بنا ہو، کیونکہ وہ معجزۂ بوقلمونی ہے، پیکرِ رحمتِ کُل

اور ہادیٔ سُبل یعنی حضرت محمدّ مصطفیٰ صلعم اس عالمگیر معجزاتی طاقت کو اپنے مخالفین کے خلاف استعمال نہیں فرماتے تھے، اس لئے کہ انہیں اپنی سنّتِ مطہّرہ کے ذریعے ساری دنیا اور عالمِ اسلام کیلئے ایک اسوۂ حسنہ قائم کرنا تھا۔

مذکورہ بالا بیان سے ان مسائل کا بھی خاص تعلق ہے، کہ کیا اس اشرف المخلوقات یعنی حضرتِ انسان نے اپنی لاانتہا ماضی میں کبھی ان بے شمار سیّاروں پر کوئی سیاحت بھی کی ہے؟ یا لاانتہا مستقبل میں ان پر کوئی سیاحت کر سکے گا؟ اگر جواب اثبات میں ہے، تو اسکی دلیل کیا ہے؟ تو اس کیلئے جواب یہ ہے، کہ ہاں! انسان نے مِن حَیثُ المجموع ان بے شمار سیّاروں کی سیاحت کی ہے، اور اب بھی ان میں سے اکثر سیّاروں پر موجود ہے، مگر سُورج نہ سیّارہ ہے، اور نہ تو اس کا یہاں ذکر کیا ہے اور انسان کی اس کائناتی سیر و سیاحت کا اثبات اس بیان کے خلاصے میں ہے کہ انسان کے مدرکات و حواس کے اعتبار سے اس کائنات کی دو صورتیں ہیں، ایک رنج کی اور دوسری راحت کی، مگر اس باب میں دو ضروری باتیں قابلِ ذکر ہیں، اور وہ یہ کہ ایک راحت نما رنج بھی ہے اور ایک رنج نما راحت بھی، لیکن ان دونوں صورتوں میں نمود کی کوئی حقیقت نہیں پس راحت نما رنج بحقیقت رنج ہی ہے، اسی طرح رنج نما راحت فی الاصل راحت ہی ہے، مثلاً: ایک شخص بظاہر راحت میں ہے، مگر اس کے بُرے کاموں کی وجہ سے اس کا ضمیر ہمیشہ بڑی سختی کے ساتھ اسے ملامت کرتا رہتا ہے، اگر اسکا ایسا احساس بھی رفتہ رفتہ ختم ہو چکا ہو، تو اسکی روح قانونِ قدرت کے عذاب میں مبتلا ہونے والی ہے، پس وہ شخص ایک راحت نما رنج میں مقید و محبوس ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص بظاہر کسی رنج میں ہے، مگر اس کے نیک اعمال کی وجہ سے اس کا ضمیر ہر وقت اسے تحسین و آفرین کرتا ہے، وہ خود شاکر ہے اور اس کی روح خدا کی ابدی رحمت میں داخل

ہونے والی ہے، تو وہ شخص ایک رنج نما راحت میں رہتا ہے، پس معلوم ہؤا کہ رنج و راحت کی منطقی تقسیم دراصل انسان کے مدرکات و حواس کی رُو سے کی گئی ہے۔

اب یہ حقیقت ظاہر کی جاسکتی ہے کہ بہشت اس کائنات کے ظاہر و باطن میں چھائی ہوئی موجود ہے یعنی وہ روحانی صورت میں بھی ہے، اور مادّی صورت میں بھی، اس زندگی میں بھی ہے، اور مرنے کے بعد بھی، اس میں درجات بھی ہیں، اور مساوات بھی، اب ان نکات کی ایک ایک دلیل ملاحظہ ہو: قرآنِ پاک کا ارشاد ہے، کہ بہشت کائنات جیسی وسیع ہے (۳: ۱۳۳)، اور دوسری ایک آیت کا اشارہ ہے، کہ بہشت کی وسعت (خود) کائنات کی وسعت ہے (۵۷: ۲۱)، تو مسافت و مقدار کی دلیل سے بہشت کی مادّیت ثابت ہوئی، نیز اگر بہشت کی وسعت کائنات کی وسعت ہے، تو کائنات کی وسعت بہشت کی وسعت ہوئی۔ درین حال ایک چیز کے دو نام ہوئے، جو درست ہے کہ کائنات کی دو صورتیں ہیں، پس کائنات کی وہ راحت جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو، بہشت کی راحت ہے، اور یہ راحت جسمانی و روحانی دونوں صورتوں میں لازمی ہے، اس بہشت کے جسمانی درجات یہ ہیں، کہ کائنات کے یہ بے شمار سیّارے عروج و ارتقاء کے اعتبار سے بے شمار درجات کے حامل ہیں، پھر روحانی درجات کی بھی وہی ترتیب ہے، اب رہا مساوات، تو وہ یہ ہے، کہ علمِ وحدت کے زیرِ اثر اہلِ بہشت کا نظریۂ فرق و امتیاز ختم ہوگا، مثلاً اگر یہ مانا جائے کہ موجودات ایک عظیم دائرے پر رواں ہیں، اور روحانی و جسمانی درجات بھی اسی پر متعیّن ہیں، تو درین صورت جس شخص کو نصف دائرے کا علم ہے، اور نصف آخر کا علم نہیں، تو وہ کبھی اگلوں کی نسبت سے اپنے آپ کو کمتر سمجھے گا، اور کبھی پچھلوں کی نسبت سے اپنے آپ کو برتر قرار

دے گا، اور جس شخص کو پورے دائرے کا علم ہے، وہ اس احساسِ کمتری و برتری سے آزاد اور ہر چیز میں برابر کی حکمت ہونے کا قائل ہے، اسکے علاوہ اہلِ بہشت ایک آخری درجے پر عملاً یکجا ہوں گے۔

تفصیلِ بالا سے ظاہر ہے، کہ اگر طریقِ علم و حکمت سے یہ حکمت سمجھ لیا جائے کہ کائنات ہی بہشت ہے، اور انسان کائنات میں ہے، تو بہشت میں داخل ہے، کیونکہ جہنّم (رنج) عارضی ہے، اور بہشت (راحت) حقیقی ہے یعنی اگر عارضی رنج کو اپنی عملی اور روحانی منطق سے کالعدم قرار دیا جائے، تو ایسے مردِ حکیم کیلئے ہر جگہ بہشت ہی بہشت ہے، کیونکہ رنج و راحت کی تقسیم ہر شخص کے اپنے ادراک و احسان کی منطق پر ہے، اور اگر ہر شخص کیلئے احساس و ادراک کا یہ مقام ممکن نہیں، تو وہ کم از کم یہ سمجھ لے، کہ وہ حضرت آدم اور اس کے ساتھیوں کی طرح ایک مقررہ مدّت کے لئے بہشت سے باہر آیا ہے، ابھی پھر اس کو بہشت کی نعمت ملنے والی ہے، اور جہنّم کی عارضیّت کی دلیل یہ ہے، کہ جہنّم ایک عملی عبرت گاہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا والے بُرے اعمال نہ کریں، ورنہ ان کا یہی حال ہوگا، پھر وہ بہشت سے محروم ہوں گے لیکن اس کے برعکس بہشت یہ کہتی ہے کہ انسان نیک کام کرے اور بہشت میں داخل ہو جائے، پس معلوم ہوا کہ جہنّم قانونِ قدرت کا ایک اصلاحی قید خانہ ہے جسطرح کسی انصاف پسند حکومت کا قید خانہ ہوتا ہے جس کی غرض اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ بُرے کاموں کو ختم یا کم کیا جائے، پھر اس میں کیا تعجب کہ ایسی کسی باصلاح حکومت میں بُرے کاموں کا خاتمہ ہو جائے، پس ظاہر ہے، کہ ایسی انتہائی ترقی یافتہ حکومت کا قید خانہ بھی نہ رہے گا۔

اس سلسلے میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ناز و نعمت والا شخص چند بڑے گناہوں کا مرتکب ہے، اور اس کے دل میں ہر وقت قید و بند

کا خوف چھائے رہتا ہے، تو سمجھ لیجئے کہ وہ ہنوز جیل سے دُور رہتے ہوئے بھی بحقیقت جیل ہی میں ہے، اور اس کے برعکس ایک نیک شخص کسی نہ کسی طرح جیل میں ہے، مگر چونکہ وہ خدا کا ایک دوست ہے، اس لئے اس کو نہ غمِ ماضی ہے اور نہ خوفِ مستقبل، کیونکہ خدا کے دوستوں کی یہی قرآنی تعریف ہے (۱۰: ۶۲)، پس اس تفصیل کا یہ نتیجہ نکلا کہ رنج و راحت کی تقسیم ہر شخص کے اپنے ادراک و احساس کی منطق پر واقع ہو سکتی ہے، لہٰذا عارضی رنج کو کالعدم قرار دینے کی صورت میں انسان ہمیشہ بہشت میں ہے، اندریں صورت بہشت کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت تو سیاحت ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ انسان سیّاروں کی سیاحت کبھی کا کر چکا ہے، اور کرتا رہے گا۔

اگر یہ سوال پیدا ہو جائے کہ کس دلیل کی بنا پر کہا جا سکتا ہے، کہ انسان اتنا قدیم ہے کہ اس نے مجموعی طور پر اس عظیم و وسیع کائنات کی سیاحت کر چکا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ملاحظہ ہو قولِ حکیمِ مطلق: "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ.... سٰفِلِیْنَ" (۹۵: ۴-۵)۔ "بے شک ہم نے انسان کو ایک بہترین ترتیب میں پیدا کیا ہے۔ پھر ہم نے اُسے پست ترین مقام میں واپس کر دیا ہے"، بہترین ترتیب میں پیدا کرنے کے معنی انسان کے انتہائی عروج تک پہنچ جانے کے ہیں، پس قرآنِ پاک کی اس حکمت سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کمالِ عروج و ارتقاء کے بعد اس سیّارہ پر آیا ہے (دیکھ لیجئے "میزان الحقائق" جو میری ایک تصنیف ہے) اگر آپ نظریۂ حکمت سے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کریں تو جگہ جگہ پر ایسے مفہومات ملیں گے، کہ اللہ پاک کی سنّت کائنات اور اس میں رہنے والوں پر لا انتہا بار گذر چکی ہے، اور اس کیلئے کوئی کام ہرگز نیا نہیں، اور اس کا امر کسی نئے موقعے کا منتظر نہیں اور اللہ کی یہ عادت ازل و ابد میں ہمیشہ ایسی ہی ہے، اور کسی چیز کی تخلیق کے لئے نہیں بلکہ اس کی انتہائی

تکمیل پر "کُن" فرمانے کے دقیق معنی ہیں۔

والسّلام

کیا آسمان و زمین

ساتساتاور چودہ۱۴ ہیں؟

سات آسمان اور سات زمین کی واقعیّت اور محلِ وقوع کے متعلق جو کچھ قدیم عقائد و نظریات عام طور پر پائے جاتے ہیں، وہ اہلِ فکر و نظر سے پوشیدہ نہیں، اسلئے ان کی تفصیل کی طرف جانا ایک غیر ضروری طوالت ہوگی، میں اس موضوع پر جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے، کہ قدیم غیر الہامی اور پس ماندہ انسان کی ذہنیت کے دائرۂ فکر و عمل کے گرداگرد لاعلمی اور ناتجربہ کاری کی جو تاریکیاں چھائی ہوئی نظر آتی تھیں، وہ اب روحانی و مادّی عروج و ارتقاء کے عملی علوم کی روشنی کی بدولت تقریباً ختم ہو چکی ہیں، آج کا انسان اپنے حیرت انگیز ایجادات و انکشافات کی عظیم الشّان کامیابی کی بنا پر کسی مستقل مایوسی کا خوف و ہراس نہیں رکھتا، وہ ان بہت سی عملی قوتوں پر قابض ہوتا جا رہا ہے، جن کے اختیار و استعمال کا تصوّر محض اپنی نارسائی کے قیاس پر کفر و شرک سمجھتا تھا، وہ اپنی ذات کی ان پوشیدہ ترقی پذیر اور آفاق گیر صلاحیتوں سے بالکل ناواقف تھا، جو قدرت کی طرف سے اُسے عطا کی گئی تھیں۔

بنابرین کیا ہمیں اور آپ کو ان بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر کچھ صلاحی غور و فکر اور اظہارِ خیال کرنے کا کوئی جواز مل سکتا ہے یا نہیں؟ یقیناً جواز مل سکتا ہے صرف یہی نہیں کہ ہم اس بارے میں فکر و نظر سے کام لینے کے

مجاز ہیں، بلکہ فی الحقیقت ہم بڑی ذمّہ داری کے ساتھ اس امرِ ضروری کیلئے مامور و مکلّف ہیں ۔ اگر حقیقتِ حال یہی ہے، تو آئیے! ہم اس ایٹمی دَور کی روحانی و مادّی معلومات کی روشنی میں زیرِ بحث نظریہ کی تحقیق کریں، اس لئے کہ حقائقِ کائنات اور عالمی اوضاع پر غور و فکر کرکے صحیح نتائج کا نکالنا اور انکے ذریعے عقائد و نظریات کی تصدیق یا اصلاح کرنا انسان کا وہ اہم ترین فرض ہے، جو اسے عقل و دانش جیسی بڑی نعمت عطا کرنے کے بعد تاکیداً عائد کیا گیا ہے ۔

فنّی انکشافات اور ان کے پس منظر میں روحانی قوتوں کی کارفرمائی کے عظیم انقلاب سے جو قدیم نظریات متاثر ہو چکے ہیں، انہی میں سے ایک نظریہ سات آسمان اور سات زمین کی واقعیت اور محلِ وقوع کے متعلق ہے، جس کے بارے میں یہاں جو حقیقت آپ کے سامنے لائی جا رہی ہے، وہ قرآنِ پاک کی روشنی میں ہوگی، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: "اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدۡ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا" (۶۵:۱۲)۔ ترجمہ: "اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے (جو پہلے سات زمینیں تھیں) اور (موجودہ سات) زمینوں کو بھی انہی کی طرح (کمالِ ارتقاء کے بعد سات آسمان بنا دے گا)، امر ان کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے، تاکہ تم کو یہ معلوم ہو سکے، کہ اللہ ہر شیٔ (فعل) پر قدرت رکھتا ہے، اور یہ کہ اللہ نے ہر شیٔ پر علم محیط کیا ہے۔"

مذکورہ بالا آیۂ کریمہ علم و حکمت کے جواہر کے ایک بے پایان خزانے کی حیثیت سے ہے، جس میں سب سے پہلے وحدانیت کا ذکر آیا ہے، اسکے بعد سات آسمانوں کی تخلیق کا تذکرہ ہو رہا ہے جس کی مثال قریب تر لاتے ہوئے یہ حقیقت سمجھائی جا رہی ہے کہ سات زمینیں بھی دائرۂ دائرات کی لاانتہا گردش میں ہر اعتبار

سے سات آسمان ہی کی طرح ہیں، یعنی اجزائے عالم کے متبادل عروج ونزول یا کمال وزوال کے کائناتی اصول کے مطابق زمین وآسمان ہی نہیں بلکہ تمام سیّاروں اور دیگر موجودات کی ایک ہی حقیقت ہے، وحدانیت کے بعد آسمان وزمین کی تخلیق اور انکی مماثلت کے بیان کا یہ مقصد ہے کہ علمِ وحدانیت کی تلاش حقائقِ کائنات کے عنوان سے کی جائے جن میں وحدانیت کا علم پوشیدہ ہے، پس حقائقِ کائنات کا خاطر خواہ مطالعہ ہم سیّارۂ زمین کے علم اور اپنی ذات کی معرفت کے ذریعے کر سکتے ہیں، کیونکہ اگر مقدم الذّکر نمونۂ عالمِ خلق ہے تو موخر الذّکر نسخۂ عالمِ امر ہے آسمان وزمین کے بعد امر کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے، اور اس ربط سے مراد یہ ہے کہ جس طرح علمِ وحدت کے پہلے مرحلے میں "عالمِ خلق" کی تخلیقی کیفیت کا سمجھنا لازمی ہے، اسی طرح اس علم کے دوسرے مرحلے میں "عالمِ امر" کی ابداعی حقیقت کا سمجھنا ضروری ہے۔ عالمِ امر کی تعریف تجرباتی حقائق کی روشنی میں "قیاسِ ضد" کے اصول پر کی جاسکتی ہے، اسکے معنی یہ ہیں کہ عالمِ امر اور عالمِ خلق ایک دوسرے کے متضاد ہیں، اسلئے عالمِ خلق پر عالمِ امر کا مفصّل قیاس کیا جاسکتا ہے، چنانچہ عالمِ خلق کائنات کا جسمِ کثیف ہے اور عالمِ امر کائنات کا جسمِ لطیف ہے، اسی طرح اگر عالمِ خلق میں روحِ کثیف پائی جاتی ہے، تو عالمِ امر میں روحِ لطیف موجود ہے، اگر عالمِ خلق کی مخلوقات علل واسباب سے اور ایک خاص مدّت کے بعد پیدا ہوتی ہیں تو اس کے برعکس عالمِ امر کے ماموراتِ عِلّت ومدّت کے بغیر موجود ہو سکتے ہیں، اور اگر عالمِ خلق عالمِ جسمانی ہے، تو اسکے مقابل میں عالمِ امر عالمِ روحانی ہے، مگر یہ خیال رہے کہ عالمِ روحانی سے وہ جہان مراد ہے، جسمیں جسم اور روح دونوں موجود ہیں لیکن اس میں روحانی طاقت انتہائی عروج پر ہے، جس طرح "جسمانی عالم" کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میں صرف جسم ہی

تھے اور اس کے سوا کچھ نہیں، بلکہ جسمانی عالم کے یہ معنی ہیں کہ اس میں روح تو کسی حد تک موجود ہے، مگر روحانیت کا ہنوز دَور دورہ نہیں ہوا۔

مذکورہ اصول کے علاوہ عالمِ لطیف اور اس کی مخلوقات کی مثال ہم ان چیزوں سے بھی لے سکتے ہیں، جو یقیناً عالمِ لطیف یعنی عالمِ امر کے نمونے ہیں۔ مثلاً نورانی، فلکی، ایٹمی اور برقی اجسام یا ذرّات اور ان کی قوتوں کے حیرت انگیز کرشمے وغیرہ، پھر ہم کس دلیل سے اشرف الحیات یعنی انسانی زندگی کو صرف عناصرِ اربعہ کے اس فرسودہ قمیص میں محدود کر سکتے ہیں، جب کہ نور، ہیولیٰ، ایٹم اور برق جیسی لطیف چیزیں بھی جسم ہیں، اور یہ چیزیں اپنی تمامتر خصوصیات میں روح کے قریب قریب نظر آتی ہیں، پس ظاہر ہے کہ یہ چیزیں عالمِ امر کے عناصر کی حیثیت سے ہیں، جو یہاں آتی ہیں، اب اس قسم کے عناصر کی مخلوق بھی پیدا ہوگئی، یا آسمان سے ایسی کوئی مخلوق اترے گی، کیونکہ عناصر اپنی قسم کی مخلوق کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

اس قسم کی مخلوقات قدیم یا جدید ناموں سے پہچانی جاتی ہیں، مثلاً: فرشتہ، روحانی، اہلِ بہشت، اہلِ سماوات، ترقی یافتہ سیّاروں کے انسان، ایٹمی مخلوق، ایٹمی انسان، اڑن طشتری کا سوار وغیرہ، اسکے علاوہ تقریباً ہر مذہب میں ایک ایسی اصطلاح بھی پائی جاتی ہے، جو روحانی دَور میں کسی آسمانی یا غیبی ہستی کے نزول و ظہور کے متعلق ہے، جس کی آخری حقیقت بھی وہی ہے، کہ انسان روحانی دَور کی آمد کے بارے میں باور کر سکے، اس مقام پر اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اگر فی الواقع اس قسم کی مخلوقات آسمان سے نازل ہو جائیں یا پردۂ غیب سے ظاہر ہو جائیں، تو دنیا والوں پر کس قسم کی حالت گزرے گی اور وہ ان مخلوقات کو کیا سمجھیں گے؟ تو میرا جواب یہی ہوگا، کہ اس واقعۂ عظیم کے اثرات کا تعلق ہر شخص کے ذاتی عقیدہ، نظریہ، علم اور سب سے بڑھ کر تجربہ سے ہے، اگرچہ علم و تجربہ ہر مشکل کام کیلئے ضروری

ہے ،لیکن اس مقام پر اسکی سب سے زیادہ اہمیت اسلئے ہے ،کہ روحانی مخلوقات کا ایک بڑا گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جسکے متعلق انسان کا جیسا عقیدہ ،جس قسم کا نظریہ اور جو علم و تجربہ ہو، وہ گروہ ویسا کچھ نظر آتا ہے اور وہ اسی کے مطابق اثر انداز ہوتا ہے ، مثلاً : ایک شخص کا علم صرف شیاطین ، جنّات وغیرہ کے وجود تک محدود ہے ،تو روحانیین اسی قسم کی مخلوق کے بھیس میں اس شخص پر اثر انداز ہونگے ، ایسے شخص کو یہ حقیقت جاننا ضروری ہے کہ جس طرح دنیا میں "ابلیس" وغیرہ کے ناموں سے شرّ و فساد کے کانٹے موجود ہیں، اسی طرح "فرشتے" وغیرہ کے ناموں سے خیر و صلاح کے پُھول بھی موجود ہوسکتے ہیں، نیز اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر انسان چشمِ بصیرت سے کام لے ،تو بُرائی کے ان کانٹوں سے اپنے آپکو بچا سکتا ہے ، اور نیکی کے پھولوں سے اپنی روح کو تازہ دم کرسکتا ہے اور ان کانٹوں کا یہ مقصد ہرگز نہیں، کہ بلاوجہ کسی انسان کے ہاتھ پاؤں چبھتے رہیں، بلکہ فی الاصل یہ کانٹے گلاب کے جھاڑ اور اس کی شاخوں ،کلیوں اور پُھولوں کی حفاظت کیلئے ہیں، تاکہ حیوانات وغیرہ گستاخانہ انداز میں انہیں نہ توڑ سکیں ،تیسری حقیقت یہ ہے ،کہ پھول اور کانٹے ایک ہی جھاڑ نے اگائے ہیں، پس وہی ایک جھاڑ ہے جس میں رنگ و بُو کے پُرمسرّت پُھول بھی ہیں ، اور دردناک چُبھن والے کانٹے بھی ، اس کے معنی یہ ہوئے کہ خیر و شرّ کی علّت ایک ہی ہے ۔

اگر عالمِ امر کے فیوض و آثار ہمیشہ آسمان و زمین کے درمیان نازل ہوتے رہتے ہیں، تو یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی مکانی واقعیت کی مزید وضاحت کریں وہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک میں حقائقِ کائنات کے کئی موازین ہیں، جن میں سے ایک "میزانِ عددی" ہے ،جس کے ذریعے کائنات کے بڑے بڑے اجزاء ، سیّاروں کے مراتب وغیرہ کی تعداد معلوم کی جاسکتی ہے ،چنانچہ قولِ قرآن ہے :

"ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ" (۱۴۳:۶) "آٹھ نر مادہ (پیدا کئے) ہیں"، آیت کا یہ حصہ بظاہر حلال جانوروں کے آٹھ جوڑوں کے ذکر کے سلسلے میں آیا ہے، لیکن اسکے معنی صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتے، بلکہ اس کا اطلاق کائنات پر بھی ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مراتبِ عالم کے آٹھ جوڑے ہیں، عرش، کرسی سات آسمان اور سات زمین کُل سولہ ہیں اور سولہ کے آٹھ جوڑے ہوئے نیز ارشاد ہوتا ہے: "وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ" (۸۷:۱۵) "اور ہم نے آپ کو سات دہرائی ہوئیں آیات دیں اور قرآنِ عظیم دیا"، مذکورہ آیت اپنے دوسرے تمام معنوں کیساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ اس عالم کے سولہ مراتب ہیں، یعنی قلم و لوح (عرش و کرسی) قرآنِ عظیم ہیں، سات آسمان اور سات زمین دہرائی ہوئیں سات آیات ہیں، نیز یہ حقیقت تقریباً سب مانتے ہیں، کہ دوزخ سات ہیں، بہشت آٹھ ہیں اور رضوان (داروغۂ بہشت) ایک ہے، جو سولہ مقامات ہوئے جن کے آٹھ جوڑے ہوتے ہیں، وہ اسی طرح کہ سُورج عالمِ اسفل یعنی مرکزی دوزخ ہے، یہ اور اس سے متّصل چھ فضائی دائرے یا طبقات سات کائناتی زمینیں بھی ہیں اور سات دوزخ بھی، ان سے باہر کے سات طبقات سات کائناتی آسمان بھی ہیں اور سات بہشت بھی، ان سے اوپر کا مرتبہ کرسی بھی ہے اور آٹھویں بہشت بھی، اس سے اوپر کا مرتبہ عرشِ اعظم بھی ہے اور رضوان بھی، پس یہ حقیقت واضح ہوئی، کہ نہ صرف آسمان و زمین کی مکانی واقعیت ثابت ہے، بلکہ عرش، کرسی، بہشت اور دوزخ کے ظاہری مقامات بھی چشمِ بصیرت کے سامنے موجود ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے، کہ فضائے عالم، سیّارات اور ثوابت کے مذکورہ مراتب کا تعین کس حقیقت کی بنا پر کیا گیا ہے؟ جسکی جوابی تشریح یہ ہے، کہ یہ کائنات اپنی سالمیت میں ایک انتہائی عظیم گول شکل کا جسم ہے، جسکے عین وسط

میں سُورج واقع ہے، جو کائناتی جہنم اور عالمی مصنوعات کے کارخانۂ آتشین کی حیثیت سے ہے، اور اس کائنات کی سطحِ محیط پر عقلِ کُلّ (عرش) اور نفسِ کُلّ (کرسی) کے عملی مراکز ہیں، لہٰذا سورج سے لے کر سطحِ محیط تک طبعی عمل کی کثافت کم سے کم اور عقلانی و روحانی عمل کی لطافت زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہے، پس اسی حقیقت کی بنا پر کائنات کے چودہ جسمانی اور دو روحانی کُلّ سولہ دائرے یا طبقات مانے گئے ہیں، جن کے خطوط فرضی ہیں، جس طرح زمین طولِ بلد اور عرضِ بلد کے فرضی خطوط میں تقسیم کی گئی ہے، پس سُورج اور اسکے گرداگرد کے چھ فضائے طبقات، سات کائناتی اراضی (زمینیں) ہیں، ان کے گرداگرد کے دوسرے سات طبقات سات کائناتی سماوات (آسمان) ہیں، اور ان کے گرداگرد خولی شکل میں نفسِ کُلّ کا نُور ہے، جو کرسی کے نام سے موسوم ہے، اور اسکے گرداگرد خولی تصوّر میں عقلِ کُلّ کا نُور ہے جو عرش کہلاتا ہے، اب سمجھ لیجئے کہ کائناتی اراضی، عالمی سماوات، ہمہ گیر کرسی اور عظیم عرش کے ظاہری وجود کے مراتب مذکورہ حقیقت کی بنیاد پر ہیں۔

اسی طرح تمام ثوابت و سیّارے تخلیق، تعمیر، عروج اور نزول کے اعتبار سے سولہ مدارج میں ہیں، اور ہر درجے میں بہت سے ثوابت و سیّارے ہو سکتے ہیں، چنانچہ عالمی مرکز (سُورج) سے شروع کر کے وہ سات قسم کے سیّارات جو تخلیق اور اپنے باشندوں کی مادّی و روحانی تعمیر و ترقی کے مختلف مراحل سے گزر رہے ہیں، سات سیّاراتی اراضی ہیں، ان سے باہر کے سات مدارج کے وہ تمام ستارے جن سے ان اراضی پر روحانی و مادّی فیوضات نازل ہوتے رہتے ہیں، سات کوکبی سماوات ہیں، ان کے گرداگرد کے ایک درجہ کے وہ تمام ستارے جو گوہرِ نفس کے ہیں، کوکبی کرسی ہیں اور انکی وحدت ہمہ گیر کرسی میں ہے، ان سے باہر کے وہ اشرف ترین ستارے جو گوہرِ عقل کے ہیں، کوکبی عرش ہیں، اور ان

کی وحدت عرشِ اعظم میں ہے۔

اب عالمِ امر اور اس کے مدارج کے بارے میں سنیے! چنانچہ اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے، کہ عالمِ خلق کائنات کا جسمِ کثیف ہے اور عالمِ امر کائنات کا جسمِ لطیف ہے، پس عالمِ امر یعنی کائنات کے جسمِ لطیف کے بھی بالکل ویسے ہی مدارج ہیں، جیسے عالمِ خلق کے ہیں، مگر ان میں اور اُن میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ عالمِ امر کے تمام مدارج زندہ ہیں، کیونکہ عالمِ امر زندہ ہے اور وہ عالمِ خلق کی روح کی حیثیت سے ہے، جس طرح انسان کی روح جسم میں ہوتی ہے، اور ایک اعتبار سے جسم روح کی گرفت میں ہوتی ہے، بالکل اسی طرح عالمِ امر اور عالمِ خلق ایک دوسرے میں داخل ہیں، بہر حال عالمِ امر اوّل کلّی طور پر سولہ مدارج میں ہے، پھر اسکے تمام ستارے سولہ مدارج میں ہیں۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ عالمِ لطیف کائنات کی زندہ تصویر ہے جس میں بیرونی کائنات کی ساری چیزیں موجود ہیں، پس ان دونوں عالموں میں دو دو قسم کے آسمان و زمین وغیرہ ہیں مگر ان دونوں عالموں کے مدارج کے بارے میں یہ اصول بھی ضرور یاد رہے، کہ ایک اعتبار سے یہ تمام مدارج سب سے اوپر کے درجے (عرش) میں ایک ہیں، کیونکہ وہ موجودات و مخلوقات کی وحدت کا مقام ہے۔ ہر چیز کی غرض و غایت، نورانی صورت، آخری خاصیّت اور قدر و قیمت عرشِ اعظم (عقلِ کُلّ) میں موجود ہے، اسلئے وہ ذاتی اعتبار سے کائنات کے ماحصل کیلئے منتظر نہیں۔

سب سے آخیر میں انسان کا ذکر آتا ہے، جو اپنے ظاہری و باطنی وجود کے اعتبار سے عالمِ تالیف کہلاتا ہے، یعنی لطیف و کثیف کا امتزاج یا مجموعہ، یعنی انسان دراصل ان دو مختلف شخصیتوں کا نام ہے، جو وجودِ کثیف اور وجودِ لطیف کی ہیں، وجودِ کثیف کو جسم اور وجودِ لطیف کو روح مانیے، پس عالمِ انسان، عالمِ صغیر یا عالمِ

تالیف کے بھی سولہ مدارج ہیں، جن کی ترتیب علم و معرفت کے اعتبار سے ہے، یہ درجات عالمِ انسانیت کے عرش، کرسی، سات آسمان اور سات زمین کی حیثیت سے ہیں، چنانچہ خدائے برتر کا قول ہے: "رَفِيۡعُ الدَّرَجٰتِ ذُوالۡعَرۡشِ" (۴۰:۱۵) "وہ درجات کا بلند کرنے والا ہے، وہ صاحبِ عرش ہے"۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مذکورہ درجات کا سلسلہ عرش تک ہے، یعنی اس سلسلہ کا آخری درجہ عرش ہے، اس حقیقت کی تصدیق کیلئے ایک اور قرآنی شہادت ملاحظہ ہو: "نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ وَفَوۡقَ كُلِّ ذِىۡ عِلۡمٍ عَلِيۡمٌ" (۱۲:۷۶) "ہم جس کو چاہتے ہیں (علم میں) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں اور ہر ذی علم سے بڑھ کر ایک اور ذی علم ہے"۔ اس آیۂ مبارکہ کے سولہ مقطع ہیں، چنانچہ: نر۱- فع۲- د۳- ر۴- جٰتٌ۵- من۶- نشا۷- ء۸- و۹- فو۱۰- ق۱۱- کل۱۲- ذ۱۳- ی۱۴- علم۱۵- علیم۱۶، پس ظاہر ہے کہ عالمِ انسانیت سولہ درجاتِ ظاہری اور سولہ درجاتِ باطنی پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک درجہ میں وہی بقائے انسانی مختلف ناموں میں موجود ہے، مثلاً فرشتہ، روحانی، نبی، ولی وغیرہ، پھر انسان مذکورہ درجات کے مطابق ظاہراً و باطناً سولہ گروہوں میں ہیں، اب عالمِ امر، عالمِ خلق اور عالمِ تالیف میں سے ہر ایک میں سولہ درجات ہوئے، اور تین دفعہ سولہ کا مجموعہ اڑتالیس ہوا جس میں ان تینوں عوالم کی مجموعی تکمیل کی نشاندہی ہے، جسکی دلیل قرآنِ پاک کے ان حروفِ مقطّعات سے مل سکتی ہے: حٰمٓ: ح + م (۸ + ۴۰ = ۴۸) کا مجموعہ اڑتالیس ہوتا ہے، جو مذکورہ تین عوالم کے مجموعی درجات کے برابر ہے۔ اب اڑتالیس کو اکائی درجات کے ہندسوں میں تحویل کیجئے، اسی طرح کہ: ۸ + ۴ = ۱۲: ۲ + ۱ = ۳ یہاں تین حاصل آیا جو اشارہ ہے کہ ان اڑتالیس درجات کی تین اکائیاں مذکورہ تین عوالم ہیں، اور اس قاعدہ کے پہلے مرحلے میں آٹھ اور چار کے مجموعے سے جو بارہ کا عدد حاصل

آیا تھا، وہ اس حقیقت کی دلیل ہے، کہ مذکورہ بالا تینوں عوالم کی متحدہ حیثیت بارہ بروج، بارہ جزائر اور بارہ جحتوں پر منقسم ہے، نیز غور سے ملاحظہ کیجئے کہ حرفِ "ح" اور "م" کی ملی ہوئی شکل (حٰمٓ) اور اسکے مذکورہ اعداد (۴۸، ۱۲، ۳) کا یہ اشارہ ہے کہ روح (ح) اور جسم (م) کا امتزاج اڑتالیس درجات، بارہ بروج اور تین عوالم میں پایا جاتا ہے، ان مقطّعات کا ایک اور ضروری اشارہ یہ ہے، کہ "حٰمٓ" نے حرفِ اوّل اور حرفِ آخر کی حیثیت سے "حیّ قیّوم" کی معنویت کو اپنے اندر سمولیا ہے، جو روح اور جسم کے مذکورہ بالا اشارہ سے زیادہ مختلف نہیں، وہ یہ ہے کہ "حی" (ہمیشہ زندہ رہنے والے) کی معرفت کا انحصار روحِ انسانی پر ہے، اور "قیوم" (ہمیشہ قائم رہنے والے) کی پہچان کا دارومدار جسمِ انسانی پر ہے۔

ایک اور اعتبار سے مذکورہ تینوں عوالم کی تقسیم اٹھارہ ہزار میں ہوتی ہے، اور اسی تقسیم کی بنا پر کائنات و موجودات کے اٹھارہ ہزار ذیلی عوالم ہوتے ہیں، چنانچہ موجودات کے سولہ درجات کا ذکر ہو چکا مگر دو گروہ اور ہیں، جن کا ذکر درجات میں اس لئے نہیں ہوا ہے کہ وہ دراصل درجات میں شامل نہیں، بلکہ وہ مساوات میں ہیں، پس موجودات کے سولہ درجات اور دو مساوات کا مجموعہ اٹھارہ ہوا، اب اٹھارہ کو ایک ہزار سے ضرب دیجئے (کیونکہ ایک ہزار تکمیلِ خلقت کا اصول ہے یعنی عقلِ کُل کا عددی فارمولا ہے) حاصلِ ضرب اٹھارہ ہزار آئے گا۔ پس درست ہے کہ تینوں عوالم کی وحدت میں اٹھارہ ہزار ذیلی عوالم ہیں۔

انسانوں کے دو گروہوں کے نظریات سے دو ہزار مساواتی عوالم کی نمائندگی و ترجمانی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان میں سے پہلے گروہ کا مقولہ "ھوالکل" ہے، جسکے معنی یہ ہیں، کہ خدا سب کچھ ہے اور اس فقرے کا فارسی ترجمہ "ہمہ اوست" ہے لہٰذا وہ لوگ ہر چیز کے نقاب میں جلوۂ ذات و صفات پوشیدہ ہونے کے قائل

ہیں، چنانچہ قرآن پاک سے یہ حقیقت ظاہر ہے: "فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"۔ (۲: ۱۱۵)
"پس تم جس طرف بھی منہ کرو، وہاں ہی خدا کا چہرہ موجود ہے"، یعنی ممکن الوجود واجب الوجود کے علم و قدرت کا مظہر ہے، اسلئے زمان، مکان، مخلوق اور موجود میں سے جس چیز کی ذات کیطرف متوجہ ہو جاؤ گے وہاں ہی خدا کا چہرہ (جلوۂ جمال و جلال) نظر آئے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب خدا آسمان و زمین کا نور ہے اور کائنات اس بے پناہ نور میں ڈوبی ہوئی ہے، تو موجودات میں بحقیقت فرق و امتیاز یا درجہ و مرتبہ کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا، بجز آنکہ یہ کہا جائے کہ امتیاز و اختلاف صرف مجازی اور سطحی قسم کا ہے نیز وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا کی جس روشنی میں کائنات و مخلوقات مستغرق ہوئی ہیں، اس نور کا دوسرا نام ہدایت ہے، پس اگر موجودات میں خدا کی عقلانی، روحانی اور مادّی ہدایت جاری و ساری ہے، تو سمجھ لیجئے کہ یہ حقیقت ہے، جسکے ذریعے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں، کہ کائنات و موجودات خدا کی ہدایت میں ارتقاء کے راستے پر گامزن ہیں، اور یہ راستہ دائرۂ امکانیت پر چکر کاٹنے کا ہے، اور اسی گردش کا نام عروج و نزول یا ارتقاء ہے، کیونکہ خدا کی یہ روشنی جس میں ہدایت کے تمام معنی موجود ہیں، حقیقی عدل سے ہرگز خالی نہیں، پس اگر ہم یہ سمجھ سکیں کہ کائنات و موجودات کا ہر ذرّہ خدائی عدل و ہدایت کے نور سے منوّر ہے، تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کیوں نہ ہو، کہ اس نورِ وحدت نے ذواتِ اشیاء کو اپنی اپنی جگہ پر ہونے کے باوجود ایک ہی وحدت میں منظم کر کے رکھا ہے، اس لئے ہمارا کہنا ہے کہ موجودات کے درجات کی نسبت ان کی شرفی مساوات خدا کی وحدت کی طرف زیادہ نزدیک ہیں اور اس نظریہ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلے میں ہونی چاہئیں وغیرہ۔

مساوات کا دوسرا گروہ وہ ہے، جسکے دانشمندوں کے اقوال کا مفہوم یہ

ہے، کہ کائنات و موجودات کی ابتدائی و انتہائی حقیقت ایک ہے جسے وجودِ مطلق کہنا چاہیئے، جو ہمیشہ بذاتِ خود موجود اور قائم ہے، اور کسی وقت میں اسکے نہ ہونے کا تصوّر غلط ہے، کیونکہ "عدمِ محض" کا تصوّر صحیح نہیں، اسلیئے کہ اس قسم کی نیستی کی کوئی عقلی دلیل موجود نہیں اس کے برعکس ہمیں اس حقیقت کی دلیل مل سکتی ہے، کہ کسی چیز کے عدم یا نیستی کے یہ معنی ہیں، کہ اس چیز کے مختلف اجزاء اپنی اپنی کلیّات میں منتشر موجود ہوتے ہیں، مگر یہ اجزاء عالم سے قطعی غائب ہو نہیں سکتے، نہ یہ جزوی مثال کائناتی عدم کی دلیل ہو سکتی ہے، کیونکہ ایک چیز سے دوسری چیز کی مثال اس وقت لی جا سکتی ہے، جب کہ دونوں چیزیں حقیقی معنوں میں ایک جیسی ہوں، مثلاً: اگر کوئی چیز اس دنیا میں ہزاروں سال بعد پیدا ہو کر پھر کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو جاتی ہے، تو اس سے ہم کائنات کی پیدائش اور فنا کی مثال لے نہیں سکتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ چیز ہزاروں سال بعد پیدا ہوئی، تو یہ "موجود سے موجود کو رکاوٹ" کا جزئیاتی قانون ہے، نیز اگر یہ چیز کچھ عرصہ کے بعد ختم ہوئی تو اس کی وجہ بھی وہی ہے، کہ دوسری چیزوں نے اس پر کچھ ایسا اثر ڈالا کہ وہ فرسودہ ہو کر ختم ہوئی، اب یہ مثال کائنات پر کسطرح صادق آ سکتی ہے؟ چنانچہ اگر ہم یہ فرض کریں کہ کائنات کھربوں سال تک موجود نہ تھی، پھر پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی، اور ایک وقت کے بعد کائنات نیستی میں چلی جائے گی۔

اب یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کائنات پیدا ہونے کے خلاف وہ کونسی طاقت یا کون سی رکاوٹ موجود تھی جسکی وجہ سے کائنات پیدا ہونے میں اس قدر تاخیر ہوئی؟ نیز یہ کہ مدّت اور سالوں وغیرہ کا حساب کس پیمانے کے مطابق ہوا، جب کہ سورج، آسمان وغیرہ نہ تھا، جن کے ذریعے وقت کا تعیّن ہوتا ہے؟ نیز اگر کائنات فنا ہونے والی ہے تو وہ کونسی بڑی طاقت ہے، جس کے زیرِ اثر یہ عالم

نیست ہو جائے؟

یہ لوگ ہر چیز کو مادّی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وجودِ مطلق (کائنات) ایک خود کار مشین کی طرح ہے جو اپنی جوہری حرکت کے بل بوتے پر ہمیشہ چلتی رہتی ہے، جس کیلئے کوئی رکاوٹ نہیں نہ اس کائناتی مشین کی طرح اور کوئی مشین ہے وغیرہ۔

بہر حال ہمیں صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ کائنات کے اٹھارہ ہزار عوالم کس طرح ہو سکتے ہیں، جس کا مفصّل ذکر ہو چکا، اب ہمیں اس آیۂ مبارکہ کا بقایا خلاصہ بیان کرنا ہے، جس میں آسمان و زمین کی تخلیق اور مماثلت کا بیان تھا، وہ یہ ہے کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر کے حقائق میں علمِ وحدانیت پوشیدہ ہے، جیسا کہ قبلاً ذکر ہوا، علمِ وحدانیت کے بعد قدرت کا ذکر آتا ہے۔ جس کا مقصد و مفہوم یہ ہے کہ قدرت (توانائی) کی تخلیق بھی فی الاصل اس وقت ہو سکتی ہے، جب کہ علمِ وحدانیت حاصل ہو جائے، اور علمِ وحدت کی ایک مثال یہ ہے کہ ہمیں قرآن اور حقائقِ کائنات کی روشنی میں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا "باری سبحان" خود کائنات کے چھوٹے بڑے کاموں کو انجام دیتا ہے یا وہ بادشاہِ مطلق ہے اور صرف امر کرتا ہے؟ اگر جواب یہ ہو کہ وہ صرف امر کرتا ہے، تو پھر ہمیں امر کی تحقیق کرنا ہوگی، اور اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ باری سبحان کا امر ایسا نہیں، جیسے کسی بادشاہ کا حکم ہوتا ہے، بلکہ وہ اس مثال سے بالاتر ہے، وہ اس طرح کہ عالمِ خلق کی کسی شیٔ پر امر (کُن[1]) واقع نہیں ہوتا ہے، جب تک اس کی تخلیق فطری صلاحیتوں کے ذریعے مکمل نہ ہو جائے، جب ایسی چیز اسی طریقے کے مطابق مکمل ہو جائے، تو اس کی ایک روحانی زندہ تصویر بھی تیار

---

[1] امرِ "کن" کے متعلق آیات اور ان کی تشریح کیلئے ملاحظہ ہو: کتاب "میزان الحقائق" ص ۷۶ تا ۷۸۔

ہو جاتی ہے۔ اب اس تکمیل پر بالآخر باری سبحان کا امر واقع ہوتا ہے وہ بھی تفہیم و تعلیم کے طور پر نہیں، صرف "کُن" فرماتا ہے جس کے معنی ہیں "ہو جا" اور وہ بھی لفظ و آواز میں نہیں، صرف ایسا ارادہ فرماتا ہے، اور وہ ارادہ بھی ایسا نہیں، کہ انسانوں کی طرح خارجی یا ذہنی واقعات و حادثات کا کوئی نتیجہ ہو، بلکہ اس چیز کی تخلیق و تکمیل اور روحانی صورت کے بارے میں اللہ پاک کے "ارادی امر" کے یہ معنی ہیں کہ وہ چیز "قانونِ فطرت" کے عین مطابق بنتی ہے۔ پس قانونِ فطرت ہی اللہ کا ارادہ اور امر ہے، جو کائنات و موجودات میں پایا جاتا ہے۔

مذکورہ حقائق کی روشنی میں اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ فطرت کا دوسرا نام قدرت (توانائی) ہے، جو ہر چیز میں اس کی ماہیت کے مطابق پائی جاتی ہے، پس ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ ہر چیز اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتی رہتی ہے، لیکن ہر چیز کا فعل علی التّرتیب دوسری تمام موجودات کے زیرِاثر وجود میں آسکتا ہے، لہٰذا بعض دفعہ اس فعل کو قانونِ فطرت کے ساتھ منسوب کرتے ہوئے کہا جاتا ہے، کہ یہ کام خدا نے کیا اور بعض دفعہ فعل کو اسکے آخری فاعل کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے، جو دونوں نسبتیں صحیح ہیں، اب اگر قرآن پاک کا یہ ارشاد ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے" یا یہ کہ "اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے" تو ہمیں اسکے بارے میں کیا سمجھنا چاہیئے؟ کیا یہ محض امکانیت کا ذکر ہے؟ یا امرِ واقع ہے؟ اس کا مفصّل جواب سطورِ بالا میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے جو ارشاد ہوا ہے، کہ اللہ وہ ہے، جس نے سات آسمان بنائے (جو پہلے سات زمینیں تھیں) اور (موجودہ سات) زمین کو بھی انہی کی طرح (کمالِ ارتقاء کے بعد سات آسمان بنا دے گا)۔ امر انکے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے، تاکہ تم کو یہ معلوم ہو سکے کہ اللہ ہر شیٔ (فعل) پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ نے ہر شیٔ پر علم محیط

کیا ہے، تاکہ ہم نمونۂ عالمِ خلق اور نسخۂ عالمِ امر (سیّارۂ زمین اور اپنی ذات) کے ذریعے اُن دونوں عوالم کے بارے میں غور و فکر کریں، اور سمجھ سکیں کہ کس طرح اللہ ہر کام کر سکتا ہے، اور کس طرح اس نے ہر چیز کو علم کی لپیٹ میں رکھا ہے۔

فهارس

آیاتِ قرآنی

۱ : ۱-۳ .... ۶۷، ۶۹
۱ : ۴ .... ۶۶، ۶۸، ۶۹
۲ : ۳۷ .... ۷۵
۲ : ۳۸ .... ۷۴
۲ : ۵۷ .... ۴۴، ۴۵
۲ : ۶۲-۶۶ .... ۴۳
۲ : ۱۱۵ .... ۹۲
۲ : ۱۵۶ .... ۱۴، ۱۵
۲ : ۲۶۹ .... ج، ۳۲
۲ : ۲۸۶ .... ۷۴
۳ : ۱۳۳ .... ۷۸
۳ : ۱۴۴ .... ۵۰
۴ : ۲۸ .... ۶۵، ۶۶
۴ : ۵۸ .... ۲۰-۲۴
۴ : ۵۹ .... ۱۶-۲۵
۵ : ۱۱۱-۱۱۵ .... ۴۲
۶ : ۱۱۵ .... ۳۹، ۴۰
۶ : ۱۴۳ .... ۸۷
۷ : ۱۳۳ .... ۴۳
۸ : ۲۶-۲۷ .... ۲۱
۸ : ۲۷ .... ۲۳، ۲۴
۱۰ : ۶۲ .... ۸۰
۱۲ : ۷۶ .... ۹۰
۱۲ : ۹۴ .... ۴۳
۱۳ : ۴۳ .... ۳۹، ۴۰
۱۵ : ۸۷ .... ۸۷
۱۷ : ۵۹ .... ۲۹، ۳۰
۱۷ : ۸۸ .... ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸
۱۷ : ۹۰-۹۳ .... ۲۸، ۲۹
۱۷ : ۱۰۱ .... ۳۳
۱۸ : ۱۱۰ .... ۵۱
۱۹ : ۱۷-۱۹ .... ۴۲
۱۹ : ۲۸-۳۰ .... ۴۳
۲۰ : ۹-۱۰ .... ۵۳
۲۰ : ۵۷-۵۹ .... ۵۲، ۵۳
۲۱ : ۷۹ .... ۴۴
۲۲ : ۷۸ .... ۳۵
۲۳ : ۱۴ .... ۷۳
۲۸ : ۸۱ .... ۴۳
۳۰ : ۳۰ .... ۴۷
۳۶ : ۳۶ .... ۱۱
۴۰ : ۷ .... ۵۸
۴۰ : ۱۵ .... ۹۰
۴۱ : ۵۳ .... ۹
۴۲ : ۵۲ .... ۱۲
۵۱ : ۲۳-۲۷ .... ۴۲
۵۴ : ۱-۶ .... ۳۱-۳۲
۵۴ : ۱۵-۲۰ .... ۴۲
۵۷ : ۲۱ .... ۷۸
۶۵ : ۱۲ .... ۸۳، ۹۵، ۹۶
۷۳ : ۱۰ .... ۶۶
۸۲ : ۱۱ .... ۷۲

۹۱ : ۹-۱۰ .... ۶۱
۹۱ : ۱۳-۱۴ .... ۴۲
۹۴ : ۷-۸ .... ۵۴، ۵۵
۹۵ : ۴ .... ۴۸
۹۵ : ۴-۵ .... ۸۰
۱۰۸ : ۱-۳ .... ۶۳، ۶۴

احادیثِ نبوی

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ اَسَّسَ دِیْنَہٗ عَلٰی مِثَالِ خَلْقِہٖ... وَبِدِیْنِہٖ عَلٰی وَحْدَانِیَّتِہٖ۔ ص۵۵
۲۔ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ۔ .... ص۳۴، ۳۸، ۳۹
۳۔ تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا۔ ص۱۰
۴۔ یَا عَلِیُّ اَلصِّرَاطُ صِرَاطُکَ وَالْمَوْقِفُ مَوْقِفُکَ۔ ص۱۳

اشاریہ

آ

حضرتِ آدمؑ .... ۴۳،۷۴

آلِ محمدؐ .... ۱۳،۲۱

آیاتِ متشابہات .... ۱۶، ۱۷، ۱۹

آیاتِ مجملات .... ۱۶،۱۹

آیاتِ مفصّلات .... ۱۶، ۱۷، ۱۹

آتشِ نمرود ۷۵

ا

ابد .... ۲۵،۸۰

ابداع .... ۲۵،۸۴

حضرتِ ابراہیمؑ .... ۴۲،۵۲، ۷۵

ابلیس ۸۶

اڑن طشتری ۸۵

ازل .... ۲۵،۸۰

اساس .... ۱۴،۶۴،۶۷

اسمِ اعظم ۱۲

اسوۂ حسنہ ۷۷

اُم الکتاب .... ۴۱،۶۶

امانت .... ۲۰، ۲۱،۲۲،۲۳،۲۴، ۶۱

اُمّتِ محمدیّہ ۱۷

امر .... ۱۲،۲۰،۲۴، ۲۵، ۲۷،۳۳،۸۳،۹۴

امرِ ابداعی ۳۴

امرِ کُلّ ۲۵

امرِ کُن .... ۲۵، ۸۱، ۹۵

امرِ مجسّم ۲۱

امرِ واحد ۲۵

انسانِ کامل ...... ۲۶، ۳۱، ۳۷، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۶۴

اولوالامر .... ج، ۱۶-۲۱

اونٹنی .... ۲۹، ۳۴، ۴۲

اہلِ بہشت ۸۵

اہلِ علم ۲۶

ایٹم .... ۱۵، ۷۳، ۸۵

ایٹمی انسان ۸۵

ایٹمی جسم .... ۷۴، ۷۵، ۷۶

ایٹمی دَور .... ۱، ۸۳

ایٹمی مخلوق ۸۵

ب

بُراق ۷۶

بروج ۹۱

بنی اسرائیل .... ۳۳،۴۴

ت

تائید .... ۱۵، ۲۲، ۶۶، ۶۸

تدریجی ہدایت ۱۷

ج

جثۂ ذُروی ۷۶

جسمِ کُلّی .... ۲، ۵۷

جسمِ لطیف .... ۱۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۸۴، ۸۹

جسمِ مثالی .... ۴۸، ۷۳، ۷۵، ۷۶

جنّ .... ۳۵، ۳۶، ۳۷

چ

چشمِ بصیرت .... ۱۰، ۱۱، ۲۰، ۸۶، ۸۷

چہرۂ خدا ۹۲

ح

حٰمٓ .... ۹۰، ۹۱

حج .... ۵۴، ۵۵

حجّت .... ۶۸، ۹۱

حدودِ دین ۱۵

حسّی معجزہ .... ۲۷-۳۰، ۳۳-۳۸

حکمتِ بالغہ .... ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۸

حضرتِ حوّاؑ ۷۴

حواریوں ۴۲

حواسِ باطن ۷۱

حواسِ خمسہ .... ۳۰، ۵۹

خ

خانۂ کعبہ ۵۴

خداوندِ زمانؑ ۱۵

خلقِ آخر ۷۳

خیرِ کثیر .... ۳۲، ۳۸، ۶۳

د

دارالحکمۃ الاسماعیلیہ ہونزہ گلگت ۸

دائرۂ روحِ کُلّی .... ۵۷، ۵۸

دائرۂ عقلِ کُلّی ۵۸

دائمی حسّی معجزہ ۳۳-۳۸

دائمی عقلی معجزہ ۳۸-۴۱

حضرتِ داؤدؑ .... ۳۴، ۴۴

دعوتِ حق ۶۳

دَورِ اعظم ۷۴

دَورِ روحانی .... ۱، ۸۵

دَورِ قیامت ۳۲

دَورِ کہین ۶۸

ر

رضوان ۸۷

روحِ انسانی .... ۵۸، ۶۱، ۹۱

روحِ کثیف ۸۴

روحِ کُلّی ۲

روحِ قدسی .... ۴۲، ۴۳

روحِ لطیف ۸۴
روحِ ناطقہ ۱۰
روحانی مجلس ۵۹-۶۱
روحانی مخلوق ۸۶
رئیس امروہوی ۸

س

سبع المثانی .... ۸۷،۶۶
حضرتِ سلیمانؑ ۴۴
سنتِ الٰہی .... ۸۰،۱۷
سیارۂ بہشت ۷۴

ش

شیر علی اختر ۸

ص

حضرتِ صالحؑ .... ۴۲،۳۴
صراطِ مستقیم .... ۵۹،۱۳
حضرتِ صفوراؑ ۵۳
صورتِ مجرّد ۲۵

ع

عالمِ ارواح ۱۷
عالمِ امر ...... ۲۵، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۹، ۹۰، ۹۴، ۹۶
عالمِ باطن ۹
عالمِ تالیف .... ۹۰،۸۹
عالمِ جسمانی ۸۴
عالمِ خواب ۷۰
عالمِ خلق .... ۸۴، ۸۹، ۹۰، ۹۴، ۹۶
عالمِ روحانی ۸۴
عالمِ صغیر ۸۹
عالمِ ظاہر ۹
عالمِ لطیف ۸۵
عالمِ وحدت .... ۹۴،۸۴
عدمِ محض ۹۳
عرش .... ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰
عرشِ اعظم ۸۹
عرفات ۵۴
عصائے موسیٰ ۳۴
عقلِ جزوی ۱۸
عقلِ کُلّ .... ۲۵، ۵۸، ۸۸، ۸۹، ۹۱
عقلی معجزہ .... ۳۰-۳۳، ۳۸-۴۱
علمِ وحدت ۷۸
علمِ لَدُنّی ۳۰
حضرتِ علیؑ .... ۱۳، ۴۱، ۵۴، ۶۴، ۶۷
حضرتِ عیسیٰؑ .... ۳۴، ۷۶
عیدِ غدیر ۵۴

غ

غدیرِ خم ۵۴
غزوۂ اُحد ۴۹
وزیر غلام علی الانہ ۸

ف

فرشتۂ جلالی ۱۳
فرعون ...... ۵۲، ۵۳، ۵۴
فلکِ اعظم / فلکِ محیط ...... ۲، ۵۷، ۵۸

ق

قارون ۴۳
قانونِ فطرت ...... ۴۷، ۹۵
قانونِ قدرت ...... ۲۵، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۷، ۷۹
قلم ۸۷
قولِ کُلّ ۲۵
قوّتِ واہمہ ۷۰
قومِ ثمود ۲۹
قومِ عاد ۴۲

ک

کثیر الذّریت ۶۳
کرسی ...... ۸۷، ۸۸، ۹۰
کلمات ۷۴
کوثر ۶۳
کوکبی عرش ۸۸
کوکبی کرسی ۸۸
کنعان ۷۶

گ

گوہرِ عقل ۸۸
گوہرِ نفس ۸۸

ل

لامکان ۵۷
لوحِ محفوظ ...... ۶۱، ۸۷

م

مائدۂ عیسیٰ ۴۵
مدینہ ۵۳
حضرت محمد مصطفیٰؐ ...... ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۷، ۱۹، ۲۸، ۲۹،
...... ۳۲، ۳۴، ۳۸، ۳۹، ۴۴، ۴۹، ۵۰،
...... ۵۱، ۵۴، ۶۳، ۶۴، ۶۸، ۷۶، ۷۷
مختارِ کُلّ ۵۶
مُدرکاتِ باطنی ۳۱
مردِ کثیر الذّریّت ...... ۶۳، ۶۴
حضرتِ مریمؑ ۴۲
معجزۂ بصری ...... ۳۰، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۵۹
معجزۂ تسخیری ...... ۳۰، ۴۴، ۴۵
معجزۂ تمثیلی ...... ۳۰، ۴۳، ۴۵
معجزۂ تنزیلی ...... ۳۰، ۴۲، ۴۵
معجزۂ ذوقی ...... ۳۰، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۵۹
معجزۂ سمعی ...... ۳۰، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۵۹
معجزۂ شامّی ...... ۳۰، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۵۹

معجزۂ لمسی .... ۳۰، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۵۹
معجزۂ محمّدی .... ۳۵، ۳۷
معراج ۷۶
معقولات .... ۱۴، ۱۵
مقامِ وحدت ۵۹
من وسلویٰ ۴۴
منازلِ یقین ۵۹
حضرتِ موسیٰ .... ۳۳، ۳۴، ۵۲، ۵۳، ۵۴
میزان الحقائق .... ۱، ۲، ۸۰
میزانِ عددی ۸۶

ن

حکیم پیر ناصر خسروؒ ۱۴
ناطق .... ۶۳، ۶۴، ۶۸
نفسِ کُلّ .... ۲۵، ۵۷، ۵۸، ۸۸
نورِ ازل .... ۵۵، ۵۶
نورِ الٰہی .... ۲۵، ۶۱
نورِ امامت .... ۴۰، ۵۶
نورِ ایمان ۶۰
نورِ علم ۱۸
نورِ قرآن .... ۳۷، ۳۹
نورِ ہدایت ۹۲
نورانی قمیص ۷۶
نوروز .... ۵۲، ۵۶

و

وجہُ اللہ ۹۲
وجہِ دین .... ۹، ۶۳
وحدت الوجود ۲۵
وحی .... ۱۱، ۱۲، ۵۱
وصی .... ۵۴، ۵۵، ۶۴
ولایت ۳۹

ہ

ہمہ اوست .... ۵۹، ۹۱
ہنگامی حسّی معجزہ ۲۷-۳۰
ہنگامی عقلی معجزہ ۳۰-۳۳
ہیولیٰ .... ۸۵، ۷۵

ی

حضرتِ یعقوبؑ ۷۶
حضرتِ یوسفؑ ۷۶
یوم الزّینۃ .... ۵۲، ۵۳
یومِ قیامت .... ۱۶، ۱۹، ۶۴

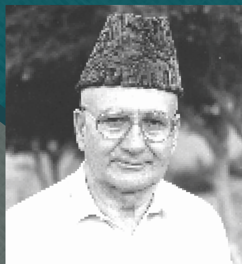

آپ اپنے زمانے کے اعجوبۂ روزگار ہستی تھے، آپ نے کسی تعلیمی ادارے سے حصولِ تعلیم کے بغیر روحانی ریاضت کی برکت سے قرآنی تاویل اور حکمت پر نظم و نثر میں ایک سو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں، آپ چار زبانوں بُرشسکی، اردو، فارسی اور تُرکی کے قادر الکلام شاعر ہیں، آپ اپنی مادری زبان بُرشسکی کے اوّلین شاعر اور صاحبِ دیوان ہیں، آپ نے قرآنی حکمت کی روشنی میں "روحانی سائنس" کا انکشاف کیا ہے، جس کی بڑے پیمانے پر پذیرائی ہو رہی ہے، اس منفرد تحقیقی خدمت کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے آپ کو ستارۂ امتیاز کے اعزاز سے نوازا ہے، بُرشسکی زبان کی ترقی اور قوم کی سماجی زندگی میں اصلاح کیلئے آپ کی کوششیں مُنفرد ہونے کے باعث آپ بابائے بُرشسکی، حکیمُ القلم اور لسانُ القوم کے القاب سے مشہور ہیں۔ آپکی گرانمایہ تخلیقات کے چند نمونے یہ ہیں، میزانُ الحقائق، عملی تصوّف اور روحانی سائنس، رُوح کیا ہے؟، کتابُ العلاج، قرآنِ حکیم اور عالمِ انسانیّت، اور آپکے جمع کردہ مواد پر مشتمل اوّلین بُرشسکی۔اُردو لُغت جو آپ کی رہنمائی میں مرتّب ہو کر کراچی یونیورسٹی سے شائع ہوگئی ہے، اسکے علاوہ آپ بُرشسکی۔جرمن ڈکشنری اور ہونزہ پرووربز (HUNZA PROVERBS) کی تدوین میں بالتّرتیب ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے پروفیسر برگر اور یونیورسٹی آف مانٹریال کے پروفیسر ٹیفو کے بھی ہمکار مصنّف (CO-AUTHOR) رہے ہیں۔

ISWLS

9 781917 149013